رجسٹر نمبر اے ۴۶۶

مارچ سنہ ۵۰ء

نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ار

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے
(معہ) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف ۔ معجزہ و کرامت ۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل ۔ طوفان نوح ۔ خضر کی حقیقت مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور وہان ماہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون ۔ سامری ۔ علم غیب ۔ دعا و توبہ ۔ لقمان۔ عالم برزخ ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت و ماروت حوض کوثر ۔ امام مہدی ۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات ۔ کاغذ سفید و بیز
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن بیان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپکو نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حُسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ تحقیقانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کسطرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مہربانی فرماکر- یہ پورا صفحہ پڑھ لیجئے

داہنی طرف نشان (X) دیکھ لیجئے

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا چندہ مارچ سنہ ۵۰ء میں ختم ہوگیا۔ اگر آپ ہندوستان میں ہیں تو آیندہ پرچہ ذریعہ وی پی بھیجا جائے گا، لیکن اگر آپ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ اپنا چندہ چھ روپیہ (پاکستانی سکہ) ہمارے نمایندہ کو حسب ذیل پتہ سے ذریعہ منی آرڈر روانہ کرکے ہم کو اطلاع دیدیجئے، تاکہ نگار جاری رکھا جائے۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی-۲۲۲-پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول - کراچی۔

پاکستان کے بہت سے خریدار

ایسے ہیں جن کا چندہ دسمبر ۴۹ء میں ختم ہوگیا تھا اس لئے سالنامہ ان کو نہیں مل سکا ہے۔ ان کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنا چندہ (چھ روپیہ پاکستانی سکہ) ہمارے نمایندہ کو حسب ذیل پتہ پر ذریعہ منی آرڈر بھیجکر ہم کو اطلاع دیدیں تاکہ خریداری جاری رکھی جائے اور سالنامہ ان کی خدمت میں بھیجدیا جائے۔ آیندہ جنکا چندہ ختم ہو وہ بھی ازراہ کرم اپنا چندہ اسی پتہ پر بھیجتے رہیں:-

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول - کراچی

کراچی، لاہور اور راولپنڈی کے ایجنٹ صاحبان کو مطلع کیا جاتا ہے کہ

جب تک تبادلۂ زر کا مسئلہ طے نہ ہوگا، نگار کے پرچے ان کو ہمارے نمایندوں کے ذریعہ سے پہونچیں گے۔ ازراہِ کرم ان کی قیمت ادا کرکے ان سے حسب ذیل پتہ پر وصول کرلیا کریں

نمایندہ لاہور
حکیم اقبال حسن صاحب -
متصل دربار داتا گنج بخش -

نمایندہ کراچی
ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی -
۲۲۲- پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول کراچی -

پاکستان میں نگار بک ایجنسی کی کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ

پاکستانی حضرات خواہ وہ ایجنٹ ہوں، یا نگار کے خریدار یا دوسرے کرمفرما ہماری کتابیں اس طرح حاصل کرسکتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیجدیں، ہم کتابیں انکو ذریعہ رجسٹری بھیجدیں گے اور وہ انکی قیمت ہمارے حسب ذیل نمایندۂ کراچی کو دست بدست دیدیں گے یا ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے —

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول - کراچی۔

WHY TAKING RISK ?

آپ کیوں خطرات مول لیتے ہیں

زندگی میں خطرات کا مقابلہ کرنا جوانمردی کا کام ہے لیکن
بلاوجہ خطرات مول لینا کسی کو زیبا نہیں دیتا خصوصاً ادویات کے ضمن میں اگر آپ
غیر مستند دواخانوں سے ادویات خریدتے ہیں تو جان بوجھ کر اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالتے ہیں
ہمدرد دواخانہ کا نام ادویات کے بہترین ہونے کا ضامن ہے۔ اور

شباب آور

ہمدرد دواخانہ کی طاقت مردمی کی بہترین دوا ہے۔ سردی کے صرف دو ماہ باقی ہیں ان دو ماہ میں آپ شباب آور کے استعمال سے جسم میں نیا خون اور جوانی میں نئی امنگ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کو کئی سال کسی اور دوا کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ آج ہی اپنے مقامی ایجنٹ سے شباب آور کی ایک شیشی خرید لیجئے۔ شباب آور استعمال کرنے کا یہ بہترین موسم ہے۔ قیمت فی شیشی پانچ روپے ؟

جوانی قائم رکھنے کیلئے رسالہ ہمدرد نوجوان اور ہمدرد شباب مفت طلب فرمائیں

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہازران کمپنی

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن، جدّہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمدورفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر
دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کرسکیں گے

مزید معلومات کے لئے
حسب ذیل پتے پر لکھئے

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی

۱۶- بنک اسٹریٹ بمبئی

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "من ویزداں" کے دونوں حصّے تیرہ روپیہ میں معہ محصول حاصل کر سکیں گے

ورنہ

غالباً دو ماہ کے بعد آپ کو یہ کتاب کسی قیمت پر نہ مل سکے۔ کیونکہ اب صرف ۱۰۰ نسخے اس کے باقی رہ گئے ہیں اور آیندہ اتنی بڑی کتاب کا چھپنا آسان نہیں ہے

من ویزداں

ایک صحیفۂ انسانیت ہے جس کے مطالعہ کے بغیر آپ مذہب کی صحیح روح نہیں سمجھ سکتے۔ **منیجر نگار**

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت کرامت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے دواخانے موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کیلئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور دو بسیر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اسکو مثل آبحیات کے تصور فرمایئے، اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دیگی۔ اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ دو ار خساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سُرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی، یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اسکے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں۔

قیمت فی شیشی ۲۴ خوراک چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے۔

میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۳۰ سالہ شہرت پر غور فرمایئے۔

پتہ:- **حکیم ثابت علی پنج زبان خوش کلام**

(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر ۳ لکھنؤ - یو - پی

گردِ راہ

رسالہ نقیب مرحوم نے اپنی سنجیدہ و متین ظرافت کے لحاظ سے جو شہرت حاصل کی تھی اسکا لطف اگر آپ اُٹھانا چاہتے ہیں تو رسالہ نقیب کے دیر وحید احمد صاحب کے سولہ مضامین کا مجموعہ "گردِ راہ" ملاحظہ فرمایئے جن کے متعلق قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:- "اقبال کے نظریۂ سعی و عمل پر وحید احمد صاحب کا مضمون تصوف اور تفسیر حیات کے نقطۂ نظر سے آپ اپنی مثال ہے" — پروفیسر سرور لکھتے ہیں:- "اکبر و اقبال پر وحید احمد صاحب کے مضامین خصوصیت سے پڑھنے کے قابل ہیں، اکبر کی شخصیت پر ان کے لطیفوں سے جو روشنی پڑتی ہے وہ ان کے بہت سے خطوط سے نہیں پڑتی۔ جو مضامین سیاسی مباحث سے متعلق ہیں ان میں بھی ایک شگفتہ اور زندہ دل شخصیت کا تبسم زیر لب ملتا ہے۔

نفیس کاغذ و طباعت، مجلد، رنگین گرد پوش - قیمت دو روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۷ | فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۵۶ء | شمار- ۳

ملاحظات ---------- ۵

جدید شاعری کا پس منظر --- بسم اللہ بیگم ---- ۹

اصلاح زبان و رسم خط ---- ح - ا ------ ۱۶

مسئلۂ ازدواج ------ اسد اللہ خاں --- ۲۲

جنگ آزادی میں اُردو کا حصہ --- خواجہ احمد فاروقی -- ۲۸

فرائیڈ، روحانیت اور اشتراکیت --- خواجہ جلیل احمد ام اے ۳۴

اشارات ------ خیر بھوروی ----- ۳۸

انیس کی مرثیہ نگاری --- مرزا جعفر علی خاں اثر- ۴۳

معلومات عامہ ---------- ۵۱

اقتباسات ------ ہماری زبان ---- ۵۵

قبل از وقت (نظم) --- فضا اعظمی ----- ۵۸

اُن کی سالگرہ (نظم) - شمس شیدائی ------ ۵۹

مطبوعات موصولہ ---------- ۶۰ - ۶۴

ملاحظات

دُنیا کا بھیانک مستقبل

سنہ ۵۶ء ایک برزخی سال ہے جس کے ساتھ بیسویں صدی کا پہلا نصف حصہ ختم ہوتا ہے اور دوسری نصف صدی کی داغ بیل پڑتی ہے - یوں تو ہماری زندگی کا ہر وہ لمحہ جو ابھی تک سامنے نہیں آیا، ایک راز ہے، ایک معمہ ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ مستقبل اپنا سایہ بہت پہلے ہی ڈالنا شروع کر دیتا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آئندہ نصف صدی کرۂ زمین کی عمر کا غالباً آخری دور ہے جس کے ساتھ اس کو ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا ہے اور فرشتوں کی اس پیشین گوئی کو کہ "انسان دُنیا میں خونریزی اور فساد کے سوا کچھ نہ کرے گا" پورا ہو کر رہنا ہے -

خونریزیاں اس سے پہلے بھی ہوئی ہیں، قومیں اس سے قبل بھی تباہ ہوئی ہیں، سلطنتیں اس سے پہلے بھی بن بن کے مٹتی رہی ہیں، لیکن وہ خوں آشامیاں اور تباہکاریاں جن کی طیاریاں انسان اسوقت کر رہا ہے، غالباً وہ ایسی نہیں ہیں کہ دُنیا ان کے اعادہ و تکرار کا منظر دیکھنے کے لئے باقی رہے، اور قدرت کو پھر تکلیف چارہ فرمائی کرنا پڑے — کہا جاتا ہے کہ انسان بالطبع مدنیت پسند پیدا ہوا ہے، وہ حیوانوں سے اس لئے ممتاز ہے کہ اس کو عقل صالح عطا ہوئی ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انسان سب سے بڑا حیوان پیدا ہوا تھا اور

وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا - ممکن ہے وہ پہلے کسی وقت یہ سوچتا ہوگا کہ کرۂ زمین بسانے اور آراستہ کرنے کی چیز ہے، لیکن اب اس کی فکر کا منتہا اسکے سوا کچھ نہیں کہ اس کو اُجاڑا جائے اور اس طرح اُجاڑا جائے کہ پھر اس کو آباد کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

انسان کے اس ارادہ کا علم تو اب سے کئی سال قبل اسی وقت ہوگیا تھا جب اس نے ہروشیما پر جوہری بم گرکر آنِ واحد میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھدیا تھا، لیکن اب جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں اس کا یہ ارادہ زیادہ مستحکم ہوتا جا رہا ہے اور دُنیا نہایت تیزی سے اس منزل کی طرف پہونچ رہی ہے جہاں قدرت کے سنگین حصار سے ٹکرا کر اسے پاش پاش ہو جانا ہے۔

جن لوگوں نے پچھلی جنگ کے اسباب کا مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ لڑائی کا بنیادی سبب صرف یہ تھا کہ ہٹلر نے اپنے قوم کے اقتدار قایم کرنے کا ذریعہ صرف جنگ کو قرار دیا تھا اور وہ ملک کی ساری دولت محض فوج کی تنظیم اور آلات حرب کی تیاری میں پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ پھر چونکہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، ہر عمل کے بعد اس کا ردِّ عمل بھی ہوتا ہے، اس لئے جب یہ طیاری مکمل ہوگئی تو ربڑ کے اس غبارہ کی طرح جو ایک معین مقدار سے زیادہ ہوا بھر جانے کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے، اس کی فوج کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہوگیا اور وہ ایک وبا کی طرح چاروں طرف پھیل گئی — پھر اگر انسان انسان ہوتا، حیوان نہ ہوتا تو وہ اس جنگ کے نتیجہ پر غور کرتا اور تمام اسلحہ کو غرقِ آب کر کے آیندہ کے لئے عہد کرتا کہ وہ اس چیز کو کبھی ہاتھ نہ لگائے گا جس سے انسان کا ایک قطرۂ خون بھی بہایا جا سکتا ہے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے یہ تو کہا کہ جنگ بہت بُری چیز ہے، اسے ختم ہونا چاہئے، لیکن اس کے ختم کرنے کی تدبیر میں وہ پھر حیوان بن گیا، اور جنگ کو روکنے کے لئے اس کا خیال پھر جنگ ہی کی طرف گیا۔ چرچل نے پچھلی جنگ میں کہا تھا کہ یہ لڑائی ہم امن جیتنے کے لئے لڑ رہے ہیں، پھر لڑائی تو جیت لی گئی، لیکن امن نہ جیتا گیا اور اب اسی امن کے قیام کے بہانہ سے پھر جنگ کی طیاریاں ہو رہی ہیں — اس وقت شرق سے لیکر غرب تک دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جسکا زاویۂ نظر اس سے علٰحدہ ہو اور ہر ملک یہی کوشش ہو رہی ہے کہ جس طرح ممکن ہو دولت کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا جائے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تیسری عالمگیر جنگ کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی جب ہروشیما پر پہلا جوہری بم گرایا گیا تھا — اس بم کے استعمال سے امریکہ نے بحر اوقیانوس کی لڑائی تو جیت لی لیکن امن ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، کیونکہ امریکہ نے یہ دیکھ کر کہ جوہری بم اتنے کام کی چیز ہے، اس کی طیاری نہایت تیزی سے شروع کر دی اور دوسری طرف روس نے یہ سوچکر کہ اگر یہی چیز کبھی اس کے خلاف استعمال کی گئی تو وہ کیا کرے گا، خود بھی بم بنانے کی طیاریاں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دُنیا کی اور تمام باتیں پسِ پشت ڈال دی گئیں اور صرف بم سازی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش ہونے لگی — اول اول تو امریکہ یہی سمجھتا رہا کہ جوہری بم تنہا اسی کی ملکیت ہے، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ روس بھی اس میں کامیاب ہوگیا ہے تو اس نے اس سے زیادہ مہلک چیز ہائڈروجن بم طیار کی۔ روس نے اس کا جواب غبارِ موت (Death Dust) کی ایجاد سے دیا۔ امریکہ نے اس کا توڑ راکٹ طیاروں سے کرنا چاہا تو روس نے اپنی آبدوز کشتیوں کو ایسا بنا لیا کہ وہ سیکڑوں میل کے بُعد سے امریکی سواحل کو تباہ و برباد کر سکیں۔ رفتہ رفتہ اس مسابقت میں دوسرے ممالک بھی شریک ہوگئے، یہاں تک کہ دنیا اس وقت صرف اسلحہ خانہ ہو کر رہگئی ہے اور اسکی تمام ذہنی قوت صرف اس کوشش میں صرف ہو رہی ہے کہ انسان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے موثر ترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے — آج دُنیا کے ہر ملک میں کاشتکاروں کی اصلاح اور زیادہ غلّہ پیدا کرنے کی عملی تدابیر پر زور دیا جا رہا ہے،

لیکن اس سے مقصود یہ نہیں کہ انسان کو غلہ ارزاں ملے بلکہ صرف یہ کہ غلہ کو بیچکر روپیہ حاصل کیا جائے اور اس روپیہ سے اسلحہ طیار کئے جائیں۔ آج مزدور جماعت کے ساتھ ہر جگہ ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے لیکن اس غرض سے نہیں کہ ان کی حالت کو بہتر بنایا جائے بلکہ محض اس لئے کہ انکو زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا اہل بناکر صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔ اور ان صنعتوں کی ترقی سے جو دولت ہاتھ آئے۔ اس کو آیندہ جنگ کی طیاری میں صرف کیا جائے ــــ آج حکومتیں بڑے بڑے تجارتی اداروں کے قیام میں سرمایہ داروں کی ہمت افزائی کر رہی ہیں، لیکن اس سے مقصود نہیں کہ تجارت کو ترقی ہو، بلکہ صرف یہ کہ اس ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس وصول ہو اور اسے نئے نئے آلات حرب بنانے میں صرف کیا جائے۔ آج دنیا کے تمام علمی تجربہ گاہوں میں کیمسٹری، بیالوجی، فزکس وغیرہ پر تحقیق کا بازار گرم ہے، لیکن اس کا مقصود علم کی خدمت نہیں بلکہ صرف یہ کہ انسان کو ہلاک کرنے میں سائنس سے زاید از زاید کتنی مدد مل سکتی ہے۔ یہاں تک کہ آج ڈاکٹر و طبیب بھی اپنے فن کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے کہ ایک مجروح سپاہی کو کس طرح جلد از جلد اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ پھر اسلحہ لیکر میدانِ جنگ میں پہونچ جائے۔ اس وقت تک ایشیا کے بعض ممالک اس وبا سے محفوظ تھے، لیکن اب وہ بھی اس میں مبتلا نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان و پاکستان بھی اس سے نہ بچ سکے اور وہاں بھی ملک کی آمدنی کا نصف حصہ صرف فوج کی طیاری پر صرف ہو رہا ہے اور دونوں ملکوں کے افق پر لڑائی کے سُرخ بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کشاکش کا نتیجہ ایک ہی ہوا کرتا ہے اور وہ اب بھی سامنے آکر رہے گا، لیکن جس وقت ہم خود اپنے ملک کی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں سخت افسوس ہوتا ہے، کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ اس دورِ بہیمیت و درندگی میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو مہاتما گاندھی کی دکھائی ہوئی راہ اخلاق و انسانیت پر قائم رہے گا اور پاکستان ہی تنہا ایسی اسلامی سلطنت ہے، جو اسلام کی بتائی ہوئی امن و سلامتی کی راہ سے منحرف نہ ہوگی۔ لیکن کس قدر صدمہ کی بات ہے کہ یہ دونوں بھی اسی خونی رو میں بہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنے انجام کی طرف سے بالکل غافل ہیں ــــ اس سے قبل دُنیا کی سیاست جو کچھ رہی ہو، لیکن اب وہ سمٹ کر صرف دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک روس کی اشتراکیت، دوسری امریکن جمہوریت، ان کے علاوہ اور جتنے چھوٹے بڑے ملک ہیں وہ سب انھیں دو میں سے کسی ایک کے حاشیہ بردار ہیں، یہاں تک کہ آج دنیا کا کوئی اقتصادی و سیاسی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی سطح کو آپ کھرچیں اور اس کے نیچے اسٹالین یا ٹرومین کا چہرہ نظر نہ آئے ــــ ہندوستان اور پاکستان دونوں اپنے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر چکے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ امن و پناہ اسی پالیسی میں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان و ہندوستان دونوں ایکدوسرے سے علٰحدہ رہکر اس پالیسی پر عمل کر سکتے ہیں ــــ اگر ہندوستان آیندہ لڑائی کی تباہیوں سے بچ سکتا ہے تو اس کی تدبیر صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ دونوں پورے اشتراک و اتحاد کے ساتھ غیر جانبدارانہ پالیسی پر قائم رہیں اور اس پالیسی کی حفاظت میں دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیں لیکن اگر ایسا نہ ہوا (جس کا موجودہ حالات کے لحاظ سے سخت اندیشہ ہے) تو پھر ان دونوں کو علٰحدہ علٰحدہ کسی نہ کسی بلاک میں شریک ہونا پڑیگا اور اسکے بعد جو کچھ ہوگا اس کے تصور سے بھی دل کانپنے لگتا ہے ــــ اشتراکی چین کا کامیابی اور روس کے ساتھ ۳۰ سال کا دوستانہ معاہدہ بڑی اہم بات ہے اور اشتراکیت و جمہوریت کے درمیان توازن قوت پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے ــــ پھر اسی کے ساتھ اگر برما، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ کے رجحانات کو دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ روس کا پلّہ برابر جھکتا جا رہا ہے، اور اسی لئے امریکہ اب بحرِ پاسفک میں ایک خاص جزیرہ کو اپنی بحری قوت کا زبردست مرکز بنانا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کا اثر جاپان پر بھی پڑے گا اور ہندوستان پر بھی۔ اور

حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ یہ زیادہ تر روس کی موافقت میں ہوگا۔ اسی لئے امریکن بلاک چاہتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے تعلقات خوشگوار نہ ہونے پائیں، کیونکہ ان دونوں کے مل جانے کے بعد ایشیا کی سیاست بالکل ان کے ہاتھ میں آجائے گی اور یورپ و امریکہ ان پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں گے ـــــ ہندوستان اور پاکستان کو سمجھنا چاہئے کہ برطانیہ و امریکہ میں سے کوئی ان کا دوست نہیں ہوسکتا، ان کے سامنے صرف ان کے اغراض ہیں جن کے حاصل کرنے کے لئے وہ ہندوستان و پاکستان کیا سارے ایشیا کو تباہ و برباد کر دینے میں تامل نہیں کرسکتے، اس لئے نجات کا صحیح راستہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو صرف یہ کہ ہندوستان و پاکستان دونوں امریکہ و روس کی طرف سے اپنی اپنی توقعات ہٹالیں اور مستحکم ارادہ کرلیں کہ خواہ کچھ ہو، وہ غیر جانبدار رہیں گے اور سرزمین ہند تک لڑائی کی آگ نہ پہونچنے دیں گے۔ لیکن اس کا امکان صرف اسی صورت میں ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات دوستانہ رہیں اور خلوص کے ساتھ باہمی ہمدردی کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ جس نے ان دونوں کے درمیان اختلاف کی زبردست خلیج حایل کر رکھی ہے، کشمیر کا مسئلہ ہے اور جب تک اس کے فیصلہ کا انحصار سیکورٹی کونسل پر ہے، کبھی طے نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ اسے طے کرنا ہی نہیں چاہتے بلکہ اس میں اور زیادہ پیچیدگی پیدا کرکے ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کو بد سے بدتر بنا دینا پسند کرتے ہیں۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف میدانِ جنگ میں اُتر آئیں اور اس طرح برطانیہ و امریکہ کو پھر یہاں درخور کا موقعہ مل جائے۔

ہندوستان کی تقسیم، سرحدوں کا فیصلہ، طبقاتی کشت و خون، کشمیر کی نزاع ان سب کے نقشے برطانیہ کی سیاسی کمیٹی پہلے ہی طیار کر چکی تھی اور جس مہرہ کی چال کے لئے جو وقت متعین ہوچکا تھا، ٹھیک اسی وقت اس کو بڑھایا گیا، یہاں تک کہ آخر کار وہ ساری بساط پر چھا گئے اور ہندوستان و پاکستان دونوں زچ ہوکر رہ گئے۔ مہاتما گاندھی اس رات کے سخت مخالف تھے کہ ملک کے کسی مسئلہ کا فیصلہ غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے اور اسی اُصول کو نظر انداز کرکے ہندوستان اور پاکستان دونوں آج اپنے آپ کو ایک ایسے جال میں پھنسا ہوا پاتے ہیں کہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ کونسل کے سامنے کسی مسئلہ کو لے جانے کے بعد پھر واپس لے لینا ممکن ہے یا نہیں، اگر ہے تو اب بھی وقت ہے کہ دونوں حکومتیں خود ہی آپس میں ملکر اس کا کوئی فیصلہ ڈھونڈھیں، یہاں تک کہ اگر غیر جنگ کے فیصلہ ممکن نہیں تو لڑ ہی لیں۔ کیونکہ یہ لڑائی پھر بھی اس لڑائی سے بدرجہا بہتر ہوگی جو امریکہ و برطانیہ کے واسطہ و اشارہ سے لڑی جائے۔

جستجو کی مستقبل

یہ نام ہے اس کتاب کا جو آیندہ اشاعت سے نگار میں مسلسل شایع ہوگی اور جس میں مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی موجودہ حالت کو پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ وہ کس نازک دور سے گزر رہے ہیں اور ان کا مستقبل کس قدر دردناک ہے۔

منیجر

جدید شاعری کا پس منظر

محمد شاہ کی کمزور حکومت اور نادری حملے نے مغلوں کی تہذیب، علم و فضل اور ان کے آرٹ کا شیرازہ بکھیر دیا۔ میر اور سودا نے لکھنؤ میں پناہ لی اور لکھنؤ شاعری اور علم و فضل کا فوارہ بن گیا، ان اساتذہ کا آخری زمانہ تھا۔ انشاؔ، مصحفی اور جرأت آگے بڑھ رہے تھے۔ شاعری کے اس ماحول میں پرورش پایا ہوا نظیرؔ اپنی انفرادیت اور "بے اصولی" کے راگ الاپ کر دنیا کو محوِ حیرت بنا گیا۔ اگر ان کے آرٹ کو بے اصول کہا بھی جائے تو تعجب نہیں کیونکہ آرٹ عرصہ تک مروجہ اصولوں کی قید و بند میں گرفتار نہیں رہ سکتا جلد یا بدیر ایک حقیقی اور طلاع فن کار پیدا ہوتا ہے اور اپنی کوششوں سے آرٹ کے مردہ جسم میں ایک نئی جان پیدا کر دیتا ہے، نظیر کی شاعری اسی بغاوت کی پیش رو تھی۔ وہ اصل میں ادبی باغیوں کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ حالانکہ سکسینہ کا خیال ہے کہ "وہ اصلاحی دور سے اس قدر پہلے گزرے ہیں کہ ان کا اثر انھیں تک محدود رہا" سرورؔی صاحب مصنف "جدید اُردو شاعری" کا بھی یہی خیال ہے کہ ایسے مخالف ماحول میں نظیر کی شاعری کسی نئے عہد کی آفرینش نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔ نظیر کا اثر تحت الشعور میں کام کر رہا تھا اور زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو بیج نظیر نے بویا تھا وہ بہت دیر میں پودھا بنا۔

حالی و آزاد دورِ جدید کی ابتدا حالی اور آزاد سے کی جاتی ہے۔ آزاد نے مناظرِ قدرت میں دلچسپی لی۔ یہ نظیر کا تحت الشعوری اثر تھا، لیکن شعوری طور پر انھوں نے اس کا اعتراف کبھی نہیں کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی سے دور ہوتے گئے۔ مناظر ان کی طویل مثنویوں میں بہت ملتے ہیں لیکن ان کو پڑھکر کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی، کیونکہ ان میں جذبات و احساسات کا رنگ نہیں ہے۔ اور زندگی سے گریز پایا جاتا ہے۔ طرزِ ادا پھیکا ہے اور نثریت غالب ہے۔ آزاد اُردو شاعری اور ادب کو ایران سے ہٹا کر انگلستان کے سپرد کر دینے کے حامی تھے اور اسی لئے انھوں نے حسن و عشق کی دنیا سے گریز کیا۔ حالی بھی آزاد کی طرح اصلیت پر زور دیتے ہیں اور طرزِ ادا میں تصنع کے خلاف تھے لیکن نئی چیز ان کے یہاں اخلاقی نقطۂ نظر کی ہمہ گیری ہے زندگی سے قرب۔ واقعیت۔ طرزِ ادا کی سادگی۔ اخلاق اور حبِ وطن سب چیزیں نظیر کی شاعری کی منت پذیر ہیں — حالی نے اسلوب بیان کی بے ساختگی۔ زبان و دل کی ہم آہنگی۔ اور فطری انداز نظیر سے حاصل کیا۔ نظیر کی طرح ان کے

یہاں بھی کوئی فلسفیانہ بصیرت یا عارفانہ رمز شناسی نہیں تھی اسی لئے نظیر کی طرح وہ بھی عوام الناس کے لئے قابلِ فہم - مانوس اور قریب تر ہیں، انھوں نے نظیر سے ایک اور سبق حاصل کیا اور وہ اصنافِ سخن کا تنوع تھا۔ یعنی غزل کے حدود سے نکل کر انھوں نے مسدس - مخمس - ترجیع بند اور ترکیب بند کا رواج زیادہ عام کیا۔

اسماعیل میرٹھی مولوی اسمٰعیل، نظیر کے بعد دوسرے سنگ میل ہیں - جن پر نظیر - آزاد، حالی، شبلی سب کا اثر ہے، لیکن وہ نظیر سے قریب تر ہیں - جدید شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی، پرانے بُت ٹوٹ چکے تھے - یا ٹوٹ رہے تھے، لیکن نئے حرم کی بنیادیں آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھیں - اسمٰعیل نے اسوقت قدم رکھا کہ دیواریں بن چکی تھیں - محرابیں جھکائی جانے والی تھیں - اسمٰعیل نے اپنی محراب کا نمونہ اس عمارت میں شامل کیا اور وہ اسوقت تک ہمارے سامنے نمونہ کی حیثیت سے موجود ہے - لیکن جو چیز انھیں حالی - آزاد - آزاد - شبلی سے ممیز کر کے نظیر سے قریب تر لے آتی ہے وہ نصب العین کا فرق ہے - ان حضرات نے اخلاق و موعظت کو لیا اور شعریت ہاتھ سے کھو بیٹھے، اسمٰعیل نے شعریت کو نہ چھوڑا - ان کا سب سے بڑا اُصول یہ تھا کہ موضوع طرزِ ادا اور اسلوب - مخاطب کی فہم کے مطابق ہو یہیں پر ان کی حدیں نظیر کی حدوں سے ملتی ہیں - اسمٰعیل کی نظمیں زیادہ تر بچوں کیلئے لکھی گئیں اس لئے اس میں تخیل اور زبان کی سادگی کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ گائی جا سکتی ہیں، اسمٰعیل کے یہاں سادگی اپنے انتہائے عروج کو پہنچ چکی ہے - یوں تو آزاد بھی سادگی کے دعویدار تھے، لیکن ان کی لفظی نقاشی نے سادگی میں عیب پیدا کر دیا - حالی اپنی سادگی کے لئے مشہور ہیں - لیکن ان کی سادگی خشک اور بے مزہ ہو جاتی ہے - نظیر کی سادگی ضرور ان کے ہم پہ ہے لیکن اب نظیر کے الفاظ نامانوس سے معلوم ہوتے ہیں اور اسمٰعیل کے الفاظ - بیان اور خیال میں یہ بات نہیں ہے دوسری چیز اسمٰعیل کی نظموں کا تنوع ہے اور اس اعتبار سے ان کا کلام عوام کا ادب بننے کے لائق ہے ان کے موضوعات عوام کی فضا میں سانس لیتے ہیں - 'اسلم کی بلّی' 'ہماری گائے' 'پن چکی' 'صبح کی آمد' وغیرہ نظمیں براہ راست ہمارے دل پر اثر کرتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں میں سے کوئی شخص ہمارے خیالات و جذبات کو شعر کے سانچوں میں ڈھال ڈھال کر پیش کر رہا ہے - منظر نگاری میں شفق - رات - گرمی کا موسم اسی قسم کی نظمیں ہیں - مقامی رنگ نظیر کے بعد اسمٰعیل میں بھی ملتا ہے - نظیر کے یہاں عمومیت ہے اور یہاں انفرادیت - نظیر کے یہاں طوالت ہے اور ان کے یہاں اجمال - لیکن اگر نظیر سے اسمٰعیل پیچھے رہ جاتے ہیں تو صرف اس بات میں کہ اُن کے یہاں جذباتی ہیجان کی کمی ہے اور کمی کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مخاطب بچے ہیں، وہ جزئیات پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔

رو آئی ہے زور شور کرتی، دامانِ زمین کو کترتی،
کس زور سے بہ رہا ہے نالا اونچے ٹیلے کو کاٹ ڈالا
بل کھا کر ندی نکل گئی ہے رخ اپنا ادھر بدل گئی ہے

بچوں کے تخاطب کی وجہ سے اصناف سخن میں سے انھوں نے زیادہ تر مثنوی کو انتخاب کیا ہے۔ بحر کی سادگی۔ اختصار اور ردیف و قافیہ کی ڈھیلی گرفت کے باعث یہی صنف موزوں خیال کی گئی۔ بچے عرصہ تک اپنے خیال۔ جذبہ اور تخیل کو انتظار کی کیفیت میں مبتلا نہیں رکھ سکتے۔ مخمس اور مسدس کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے، اگر وہ ثمنویت سے ہٹے بھی ہیں تو الفاظ کی موسیقیت اور ٹیپ کے مصرعے کی تکرار سے اس کمی کو پورا کر لیا ہے۔ اس سلسلہ میں "صبح کی آمد" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے — خوشی سے ہر اک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے — سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں غل مچاتی — اِدھر سے اُدھر دوڑ کے آتی جاتی
دموں کو ہلاتی پروں کو پھلاتی — مری آمد آمد کے ہیں گیت گاتی
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

جو اس وقت جنگل میں بوٹی جڑی ہے — سو وہ نو لکھا ہار پہنے کھڑی ہے
کہ پھلے کی ٹھنڈک سے شبنم پڑی ہے — عجب یہ سماں ہے عجب یہ گھڑی ہے
اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

یہ نظم ان کی بہترین نظموں میں سے ہے۔

کلیم الدین صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسمٰعیل کی نظموں میں تازگی ہے۔ معصومیت ہے اور باوجود قوافی کو نظر انداز کرنے کے ان کی نظموں میں ترنم اور موسیقیت ہے گویا نظیر کے بعد اگر کسی کی شاعری کچھ نہ کچھ گیت کی تعریف میں آتی ہے تو وہ اسمٰعیل کی نظمیں ہیں۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ حالی۔ آزاد اور اسمٰعیل اپنی اپنی جگہ اُردو شاعری کو عوام سے قریب تر لانے والوں کی صفِ اول میں ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے گیت کی صنف کو شعوری طور پر اُردو میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ سب اس راستے کے سنگِ میل تھے جس پر اُردو شاعری چلکر اپنے قدرتی منزلِ مقصود کو پہونچنا چاہتی تھی۔ شاعری کی یہ منزل سب سے پہلے عظمت اللہ کے یہاں ملتی ہے اور پھر شوق قدوائی میں جو اپنی جدت پسندی اور داخلی رنگ کے لحاظ سے اُردو میں ایک خاص طرز کے مالک تھے، ان کے یہاں زبان کی سلاست۔ بحروں کا ترنم اور عورتوں کے جذبات کی مصوری ان کی نظموں کو گیت سے قریب تر کر دیتے ہیں۔ ان کی نظم عالمِ خیال، میں زبان، روزمرہ، طرزِ ادا سب میں عورتوں کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے، لیکن صرف تعلیم یافتہ عورتوں کی،

تاہم چونکہ تعلیم یافتہ عورتیں بھی آخر عورتیں ہی ہیں اور ان کے جذبات وہ ہی ہیں جو ہر عورت کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو گیت کی طرف اُردو کا قدم بڑھانے والوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

شوق ریختی کے شعراء کے بعد شوق پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اس طبقہ کے جذبات پیش کرنے کی ہمت کی اور ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ ایک حد تک اس لئے کہ عورت کے نفسیاتی عمل اور ردّ عمل سے واقف نہ ہو سکنے کے باعث نفسیاتی غلطیاں کر گئے ہیں اور وہ یہ کہ جہاں جذبات نگاری میں عورتیں صرف اشارہ و کنایہ سے کام لیتی ہیں ان کے یہاں تفصیل پائی جاتی ہے۔ نیچرل نظموں میں بھی 'بہار' اور 'ہندوستان کی برسات' ان کی منظر نگاری پر قادر ہونے کا پتہ دیتی ہیں لیکن منظر نگاری کے معاملہ میں آزاد۔ حالی۔ اسمٰعیل کی سی سادگی اور پُرکاری ان کے یہاں نہیں ہے۔ نظم بہار میں انھوں نے پپیہے، کوئل، کوکلا، بلبل، شاما، چنڈول، طوطی، بھنگراج، مینا سب ہی کو جمع کر دیا ہے لیکن فارسی ترکیبوں سے بوجھل کر کے اس کے حقیقی لطف کو کم کر دیا ہے۔ تاہم یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ شاعری کا سیل رُک رُک کر سہی، لیکن یقینی طور پر گیت کی طرف بہ رہا ہے۔

اصناف سخن میں بھی ان کو کوئی جدت نہیں سوجھی۔ ان کے ہمعصر طباطبائی نے ضرور غیر مقفیٰ نظموں اور آزاد ترجموں سے نثر کی طرح معرّا نظموں کی طرف قدم بڑھایا اور اپنے زمانہ کے لوگوں کو اس صنف نظم سے کچھ زیادہ مانوس بنا دیا۔

اصلاح کا نیا دور اس کے بعد اُردو اپنے نئے دور میں داخل ہوتی ہے جس میں علاوہ مستغربین کے اقبال۔ سلیم۔ سرور۔ چکبست اور عظمت اللہ خاں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اقبال اپنے فلسفہ اور اسلام میں راسخ الاعتقادی کے باعث عوام کے شاعر نہ بن سکے اور خواص کے لئے مخصوص ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کے تخیل کی بلند پروازی کا ساتھ اُردو جیسی کم مایہ زبان نہ دے سکی اور ان کو اپنے پیغام کو موثر بنانے کے لئے فارسی کی راہ اختیار کرنی پڑی، لیکن اقبال کا ایک بڑا احسان یہ ضرور ہے کہ قومی و وطنی شاعری کو ان ہی کی وجہ سے فروغ ہوا اور سلیم۔ سرور۔ چکبست اور جوش میں سے ہر ایک ان کا خوشہ چیں ہے۔

وحید الدین سلیم وحید الدین سلیم نے شعر و شاعری نوعمری ہی سے شروع کر دی تھی۔ لیکن اول اول سیاست و صحافت میں اُلجھے رہے اور اخیر عمر میں ان کی شاعری کو چمکنے کا موقع ملا۔ ان کی شاعری میں جدت انفرادیت ہے۔ اسالیب بیان میں بھی انھوں نے رسوم دیرینہ سے انحراف کیا۔ زبان کی اصلاح کے سلسلہ میں لکھنؤ اور دہلی کی اجارہ داری کو ختم کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ خود اپنی زبان کے متعلق فرماتے ہیں:۔

از راہ طنز کہتے ہیں اہل سخن سلیم دہلی و لکھنؤ سے جدا رنگ ہے میرا

سلیم کا رجحان عربی و فارسی کی بہ نسبت ہندی کی طرف زیادہ ہے۔ فطرت نگاری میں وہ کہیں کہیں نظیر سے ٹکر کھا جاتے ہیں۔ مثلاً

جب نیم کی شاخیں ٹھنڈی ہوا کھا کے تھرکنے لگتی ہیں
پھر زریں کرنیں سورج کی پتوں پہ چمکنے لگتی ہیں،
پتوں کی رگوں میں نیم کا رس ہے دوڑتا پوری سرعت سے
یہ ریشہ دوانی دیکھ کے میں تصویر بنا ہوں حیرت سے
کیا فیض الٰہی کی کرنیں پڑتی نہیں مجھ پہ شام و سحر
کیا موج نسیم رحمتِ حق چلتی نہیں مجھ پر آٹھ پہر
پھر کیا ہے کہ نیم کا جوش نمو پاتا نہیں اپنے سینے میں
دل مردہ ہے افسردہ ہے مشغول نہیں رس پینے میں

سرور — سرور جہاں آبادی نے بھی شاعری میں مقامی رنگ بھرنے اور اس کو وطنی اور قومی بنانے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ بقول پروفیسر سرور "سرور کی طبیعت کو فلسفیانہ کاوش اور جستجو سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ عوام کے جذبات کی ترجمانی اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ اور گرد و پیش کے مناظر کی تصویر بھی خوب کھینچ لیتے ہیں"۔ ان کی نظمیں 'جمنا جی'۔ 'گنگا جی'۔ 'پریاگ کا سنگم'۔ 'روٹھی رانی'۔ 'لکشمی جی'۔ 'چتوڑ کی گزشتہ عظمت' اور رامائن اور مہابھارت کے چند سین وغیرہ عوام کے دل و دماغ دونوں کو اپیل کرتی ہیں اور اسی لئے سرور عوام کے شاعر کہلائے جانے کے مستحق ہیں — عوام کے گیتوں میں وطنیت اور قومیت کا رنگ، اپنے ملک کے قدرتی مناظر، یہی گیتوں کے موضوع ہیں۔

سرور کی طرح چکبست بھی اقبال سے متاثر تھے۔ ان کی ابتدا کے زمانے کی نظمیں 'خاک ہند'، 'وطن کا راگ'، "ہمارا وطن" وغیرہ نظمیں اسی لے میں ملتی ہیں، جس میں اقبال نے قومی ترانہ گایا تھا۔ منظر نگاری میں 'سیر دہرہ دون' ان کی جزئیات نگاری اور حسن ذوق کا پتہ دیتی ہے۔ زبان صاف اور عام فہم ہے۔ خیالات تعقید اور فلسفہ سے مبرا ہیں۔ ان کے یہاں ایک عام ہندوستانی کے جذبات کا پرتو ہے، طرز ادا میں سادگی ہے ان کی شاعری میں اصلیت ہے، رنگینی ہے، درد ہے اور اس حیثیت سے ان کی نظمیں ان گیتوں کے پیش رو ہیں جو قومی یا وطنی جذبہ کے تحت بعد میں تصنیف کی گئیں۔

عظمت اللہ خاں اس نئے دور کی شاعری میں عظمت اللہ خاں کی ہستی بہت نمایاں ہے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے اور چالیس سال زندہ رہ کر ۱۹۳۷ء میں انتقال کیا، عظمت اللہ خاں حقیقی معنوں شعلۂ مستعجل نظر آتے ہیں، لیکن اس تھوڑے عرصہ ہی میں موضوع، زبان، طرز ادا اور عروض سب سے بغاوت کا علم بلند کیا اور صرف کہنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے بنائے ہوئے اصول کی روشنی میں شاعرانہ تعمیر کے نادر نمونے بھی چھوڑ گئے۔

حالی اور آزاد کی طرح عظمت اللہ خاں کو بھی اپنا نصب العین "شاعری" پر ایک طویل نظم لکھ کر ظاہر کرنا پڑا۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے اور اس کی تربیت اس کے پیش رو یا ہمعصر شعرا کے کلام سے ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "فطرت انسانی کا انفرادی اور اجتماعی رنگ شاعر کی مصوری کے لئے ایک زبردست موضوع ہے فطرت کے بے گنتی روپ۔ انسان اور سماج کے بے شمار سوانگ ان سب کی تصویر کھینچ سکتی ہے ان کو تخیلی پیکر دیا جا سکتا ہے"

شاعری کے موضوعات کے متعلق عظمت اللہ خاں کا یہ نظریہ ناقابل تردید ہے۔ لیکن اس کے لئے ذاتی مطالعہ، ذہنی اور جسمانی تجزیہ اور زندگی کے بہاؤ میں غوطہ لگانا ضروری ہے اور یہی چیزیں شاعری میں داخلیت کا رنگ بھر دیتی ہیں۔

دوسری چیز ان کے یہاں اصلیت ہے جو اُردو شاعری میں بڑی مشکل سے ہاتھ آتی ہے، نظیر مستثنیات میں سے ہیں۔ غزلوں میں کہیں کہیں یہ جلوے ہیں لیکن عام طور سے اُردو شاعری میں اس کی کمی ہے۔ تیسری چیز جو ان تخئیلی پیکروں میں جان ڈالتی ہے وہ تشبیہ ہے اور چوتھی چیز الفاظ کا جامہ ہے۔ اور وہ اُردو شاعری کو انھیں خصوصیات سے مالا مال کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو سیاسی، سماجی، معاشیاتی، علمی اور تعلیمی، اخلاقی پستی ہندوستان میں انتشارِ سلطنتِ مغلیہ سے ہوئی اس کی وجہ سے ہماری شاعری غزل میں سکڑ کر رہ گئی۔ اور شاعری غیر فطری جکڑ بندیوں اور فارسی کے بھونڈے نمونوں اور سانچوں میں پھولنے پھلنے لگی"۔ لیکن غزل کی اس لے دے میں غزل کے موافقین اور مخالفین دونوں غلط مبحث کا شکار ہو جاتے ہیں، موافقین ایک سرے سے اس کی بُرائی سننا ہی نہیں چاہتے اور مخالفین اس میں کوئی خوبی کسی قسم کی نہیں پاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری دکن سے دہلی آنے کے بعد اونچے طبقہ کی شاعری بن گئی تھی اور ضرورت تھی کہ اسے پھر عوام کی چیز بنایا جاتا جس کی تحریک نظیر نے کی۔ حالی نے اس آمد کا غلغلہ بلند کیا۔ لیکن عظمت اللہ خاں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جو اصلاح کرنا چاہی وہ یہ تھی کہ:-

"شاعری کو قافیہ کے استبداد سے نجات دلوائی جائے ..... قافیہ کی اس بدعنوانی اور بدکرداری جبر و استبداد کو غزل نے اپنی گود میں پالا۔ اس قدر پال پوس کر جوان کر دیا کہ قافیہ نے تخئیل اور خیال کو اپنے شکنجہ میں پھانس لیا اور اپنا مطیع کر لیا۔ اس سے خیال کی آزادی اور نشو و نما کو جو صدمہ پہونچا اور اُردو شاعری جس حد تک بے جان ہوئی اس کی مثال ہمارے شعراء کی غزلوں سے بھرے ہوئے محض لفظی طلسمات والے دیوان ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے"۔[1]

یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن اس کا علاج جو تجویز کیا ہے کہ "غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان ماردیجائے" درست نہیں۔ غزل کی گردن مارے بغیر بھی قافیہ کی قید سے رہائی ممکن ہے۔ غزل کو اُردو شاعری سے نکالے بغیر موجودہ سخن کے علاوہ نئے سانچے مستعار لئے جا سکتے ہیں یا ڈھالے جا سکتے ہیں۔ ان سانچوں کو ڈھالنے کی تلقین کرتے وقت عظمت اللہ خاں جوشِ اصلاح میں موجودہ شعر و سخن کے عام سانچوں کو بھی 'بے دردی' کے ساتھ شاعری سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ یہ تو جوش میں کہہ گئے ورنہ وہ بھی جانتے تھے کہ شعر و ادب کے معاملے میں انتہا پسندی اور عجلت پسندی بعض اوقات خود مقصد کو فوت کر دیتی ہے۔ جس بات کی عظمت اللہ خاں کو تمنا تھی وہ پیدا ہو رہی ہے۔ موجودہ شعراء متغزلین کو چھوڑ کر سب کے سب عظمت اللہ خاں کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہے ہیں۔

---

[1] سرِ لے بول

دوسری اصلاح اُردو شاعری میں تسلسل خیال اور مسلسل گوئی پیدا کرنا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اُردو شاعری کی مروجہ بحریں اور مروجہ اوزان (جو تنگ سے تنگ تر ہو گئے تھے) میں اصلاح کی جائے۔ عظمت اللہ خاں نے اُردو عروض پر کئی اعتراضات کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ اُردو عروض تنگ و محدود ہے۔ دوسرے وہ ہندوستانی اور آریائی بوباس کے مطابق نہیں۔ تیسرے وہ ہر قسم کے خیالات، جذبات و تاثرات کو شعری سانچے میں ڈھلنے کے لئے کافی لوچ نہیں رکھتا۔ اس تبدیلی کے لئے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اولاً اُردو عروض کی بنیاد ہندی پنگل (عروض) پر رکھی جائے اور صرف ہندی عروض کے سانچوں کو من وعن قبول نہ کیا جائے بلکہ ان کے مطالعہ اور تجربہ کے بعد انھیں سے جو بحریں عروض کے مطابق نظر آئیں انھیں قایم رکھا جائے۔ اضافہ کے لئے انگریزی بحروں کا بھی تجربہ کیا جائے۔

ان کی شاعری کے موضوعات عورت، جذبات نگاری۔ سراپا نگاری سب سے زیادہ نمایاں ہیں اور دوسرے درجہ پر مناظر نگاری ہے وہ عوام کے شاعر تھے اور ان کے لئے گیت لکھتے تھے۔ وہ حُسن و عشق کے مسایل کو دور سے تماشہ دیکھنے والے کی طرح نہیں پیش کرتے بلکہ اس رُخ کو پیش کرتے ہیں جو ہر فرد کے سامنے آچکا ہے یا آسکتا ہے۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں سرلاپن اور ان کی زبان میں شیرینی پیدا ہو گئی ہے۔

دوسری چیز جو عظمت اللہ خاں کی شاعری کو اپنے پیش روؤں کی شاعری سے ممتاز کرتی ہے، وہ اسکا سرلاپن ہے اور یہ سرلاپن ہندی بحور کے استعمال سے پیدا ہوا ہے۔ نظیر کے ساتھ ساتھ عظمت اللہ خاں بھی اُردو شاعری میں ہندوستان کے فطری جذبات کی عکاسی اور ہندوستانی زبان کے علمبردار ہیں۔ اس بحث کی روشنی میں عظمت اللہ خاں کے شاہکاروں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ (باقی)

بسم اللہ بیگم

شامِ اَودھ

(ناول)

مصنفہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم۔اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

جس میں بلدۂ حسن و شباب اور سرزمین نغمہ و رنگ یعنی لکھنؤ کی اس معاشرت کی دلچسپ تصویر پیش کی گئی ہے، جس پر ساری دُنیا نے رشک کیا۔ اگر شاہانِ اودھ کے محل خانوں کی رنگ رلیاں، بیگموں کی زبان، لکھنوی محاورے، اور مشرقی تمدن کے ڈوبتے ہوئے سورج کی شفقی رنگینی دیکھنا ہے تو اس ناول کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

حجم ۲۰۴ صفحات۔ مجلد۔ معہ رنگین گرد پوش۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ (صہ)

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

اصلاحِ زبان ورسم خط

اخبار اسٹیٹسمین کے سنڈے ایڈیشن مورخہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۹ء کے ضمیمہ میں انگریزی کے مشہور و معروف ادیب 'برنارڈ شا' کا ایک مضمون شایع ہوا ہے۔ یہ مضمون بہت مختصر ہے اور ہیڈ ماسٹر ایٹن کالج کے جواب میں لکھا گیا ہے جس کا ایک لکچر حال ہی میں اس سوال کے متعلق ریڈیو سے نشر ہوا تھا کہ کونسی زبان ساری دُنیا کی زبان بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔ لکچرار صاحب نے انگریزی زبان کو مشکل قرار دیکر رائے ظاہر کی تھی کہ صرف فرانسیسی زبان آفاقی زبان بنائے جانے کی اہل ہے۔

'برنارڈ شا' کی خصوصیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی انوکھی بات کہتے رہتے ہیں اور اگر بات انوکھی نہ بھی ہوئی تو کہنے کا طرز اور انداز ضرور انوکھا ہوتا ہے۔ اپنے مضمون میں اُنھوں نے لکچرار صاحب کی رائے کے متعلق تو کوئی خیال ظاہر نہیں کیا لیکن ضمنی طور پر یہ کہا ہے کہ بین الاقوامی زبان کے مسئلہ پر مدتوں سے بحث جاری ہے اور یونہی جاری رہے گی جب تک کہ حکومتوں اور پبلک کا یہ خوف نہ ہٹا لیا جائے گا کہ اُن کی زبانوں کے طریقِ ہجا بدلنے سے ناقابلِ برداشت صرفہ کا بار پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ جب تک اُن کو اعداد اور واقعیت کی روشنی میں یہ نہ بتایا جائے گا کہ 'ہجا' کی اصلاح سے کس قدر محنت۔ کس قدر وقت اور کس قدر صرفہ کی بچت حقیقتاً ہو گی اُسوقت تک وہ اِس طرف مطلق توجہ نہ دیں گی اور یہ بحث رہتی دنیا تک یونہی قایم رہے گی۔ شا کے نزدیک 'اسپرنٹو'، شارٹ ہینڈ وغیرہ کے رائج شدہ طریقوں میں بھی وہی دقتیں موجود ہیں جو سادہ طریقِ تحریر میں ہیں یعنی صرفہ، وقت اور محنت کی زیادتی۔

اس تمہید کے بعد ادیبِ موصوف انگریزی زبان کی مشکلات کو معرضِ بحث میں لاتے ہیں۔ انگریزی زبان دُنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اور جب سے وہ بنی ہے اُس میں آج تک بہت سی تبدیلیاں باعتبار ہجا و تلفظ ہوتی رہی ہیں۔ معمولی انگریزی داں پُرانی انگریزی کو نہ صحیح طور پر پڑھ سکتا ہے اور نہ دُرست طریقے سے بول سکتا ہے جب تک کہ خاص طور پر مطالعہ کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ چوسر یا شکسپیر کس طرح بولا کرتے تھے اس کی نقل تو صرف مخصوص ماہرین ہی کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک پُرانی کتابت کا تعلق ہے الفاظ میں حروف زیادہ پائے جاتے ہیں۔ برنارڈ شا کا خیال ہے کہ اگر حروف کم ہوتے تو شاید قدیم مصنفین اور زیادہ لکھ سکتے تھے۔ اُن کے نزدیک انگریزی زبان کی مشکلات اُسکے طریقِ ہجا سے متعلق ہیں اور یہ کہ اس طریقے کی ساری خرابیاں ڈاکٹر جانسن کی پیدا کی ہوئی ہیں جس نے اٹھارویں صدی میں

انگریزی زبان کی ڈکشنری بناتے وقت الفاظ میں غیر ضروری حروف کی تعداد پر توجہ نہ کی اور مروجہ رسمِ ہجا کو قایم کر دیا۔ تمثیل کے طور پر صاحب موصوف انگریزی کے دو لفظ پیشِ نظر لاتے ہیں۔ ایک لفظ (shell) شِل (بمعنی گولہ یا گھونگا) ہے۔ اس لفظ کو اُنھوں نے محض اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے پیش کیا ہے کہ فرانسیسی زبان انگریزی سے مشکل ہے کیونکہ فرانسیسی لفظ میں جس کا تلفظ یہی ہے آٹھ حرف ہیں اور انگریزی میں صرف پانچ۔

دوسرا لفظ (debt) 'ڈیٹ' (بمعنی قرض) ہے۔ اس میں حرف 'ب' زاید ہے یعنی ہجا کے اعتبار سے تو 'ڈیبٹ' بولا جانا چاہئے تھا لیکن اُس کا واقعی تلفظ 'ڈیٹ' ہے۔ اس چھوٹے سے لفظ کو لیکر 'شا' نے حیرت انگیز استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص لفظ 'debt' کو متواتر ایک منٹ تک لکھے جائے اور اُس کے بعد اُسی طرح لفظ 'det' کو ایک منٹ تک متعدد بار متواتر لکھے جائے تو جتنے وقت میں یہ دونوں الفاظ فی منٹ کے حساب سے لکھے جائیں گے اُس کا فرق بارہ سیکنڈ ہوگا۔ اس فی منٹ فرق کے اعتبار سے اگر حساب لگایا گیا تو ایک سال میں تہتر (۷۳) دن کا فرق ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص مسلسل دن رات سال بھر تک لفظ 'debt' کے بجائے لفظ 'det' لکھے جائے تو اُس کو تہتر دن کی محنت اور وقت کا نقصان ہوگا۔ بعد ازیں انھوں نے دوسرا یہ حساب لگایا ہے کہ اگر صرف ممالک امریکہ اور برطانیہ تک تحقیقات محدود رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ممالکِ مذکور میں ایسے لوگوں کی تعداد جن کی پیدائشی زبان انگریزی ہے اور جو انگریزی میں لکھ پڑھ سکتے ہیں ستائیس (۲۷) کروڑ ہے۔ اور ان لوگوں میں سے ایسے مصنفین۔ نامہ نگار۔ محرر۔ محاسب۔ ادیب۔ خط لکھنے والوں کی تعداد جو بیک وقت مسلسل چوبیس گھنٹے لکھنے میں مصروف متصور ہو سکیں اگر فی سیکڑہ ایک بھی قرار دیجائے تو مجموعی تعداد ستائیس لاکھ ہوگی۔ اب اگر ایک شخص سال بھر میں تہتر دن زیادہ محنت اور زیادہ وقت صرف کرتا ہے تو ستائیس لاکھ لکھنے والے آدمی فی سال پانچ لاکھ سال کی محنت اور وقت محض ایک بیکار حرف کے زاید لکھے جانے کی بدولت ضایع کرتے ہیں۔ اس حساب میں ہندوستان۔ پاکستان اور لنکا شامل نہیں۔

'ہجا' کی اس صورت اور کیفیت کی موجودگی میں بین الاقوامی زبان۔ بچوں کے طریقۂ تعلیم اور مستند صوتی تلفظ کے متعلق جملہ بحث برنارڈ شا کے نزدیک حماقت میں داخل ہے۔ صاحبِ موصوف کا سارا زور ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری پر ہے، جس کی بدولت انگریزی کے چالیس حروفِ تہجی نہ بنائے جا سکے۔ اُن کا خیال ہے کہ انگریزی میں چودہ جدید حرف اضافہ کرنے کی ضرورت ہے اور یہ حروف اُن اجنبی زبانوں کے حروفِ تہجی میں سے پسند کئے جا سکتے ہیں جو انگلستان کے چھاپہ خانوں میں غیر زبانوں کی کتابیں چھاپنے کے لئے ہر وقت مہیا رہتے ہیں۔ خود اپنا تجربہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ستر سال سے زیادہ تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں کتابیں۔ مضامین۔ ڈراما۔ خطوط وغیرہ صاف اور ستھرے حروف میں صوتی تلفظ کے اصول اور طریقے پر لکھتے رہے ہیں اور اس طرح اُنھوں نے شیکسپیر وغیرہ کے مقابلہ میں

فی سال دو ماہ کا اضافہ اپنی ادبی خدمت کی عمر میں کیا ہے۔

وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیندہ بین الاقوامی زبان کیا ہوگی لیکن وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ دُنیا اختصار چاہتی ہے اور اِس ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ سب جگہ وہ زبان جاری ہو جائے جس کو پِڈگن (Pidgin) کہتے ہیں — (پڈگن اُس طرح کی بات چیت کو کہتے ہیں جیسے ریلوے اسٹیشنوں اور بندرگاہوں پر غیر ملکی مزدور انگریزی بولتے ہیں)۔ برنارڈ شا فرماتے ہیں کہ آیندہ صرف اُس قدر الفاظ بولنا کافی تصور کیے جائیں گے جن سے کہنے والے کا مطلب سمجھ میں آجائے اور جو صرف و نحو کی پیچیدگیوں سے پاک و صاف ہوں۔ مثلاً اُنھوں نے دو جملے پیش کیے ہیں۔

ایک یہ ہے:- I regret to have to inform you that it is not possible for me to entertain the proposal in your esteemed letter

دوسرا پڈگن کے طریق پر:- "Sorry - no can"

یعنی مروجہ تجارتی زبان میں یوں کہیں گے کہ "میں افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کے نامۂ گرامی میں پیش کی ہوئی تجویز کو قبول کروں"، لیکن پڈگن زبان میں اس خیال کو اس طرح ظاہر کریں گے "افسوس - نہیں کر سکتا؟"

بچوں کی تعلیم کے متعلق وہ صرف اس قدر کہتے ہیں کہ بچے حرف شناسی اور پڑھنا نظر سے سیکھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جن بچوں کا حافظۂ باصرہ کمزور ہوتا ہے وہ الفاظ کو غلط ہجا کے ساتھ لکھتے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ بچوں کو صوتی تلفظ کے مطابق ہی الفاظ لکھنا سکھانا چاہئے۔ تعلیم زبان کے متعلق صرف یہ اصول ہونا چاہئے کہ جس نقطہ پر پہونچکر کہنے والے کا مفہوم معلوم ہو سکے اُس سے آگے سکھانے کی ضرورت نہیں۔

متذکرۂ بالا مضمون پڑھ کر مجھے اپنی پریشاں خیالی یاد آئی جسے آپ نگار ماہِ جولائی ۱۹۴۹ء کے پرچہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ گو یہ خیالات اُسوقت ظاہر کئے گئے تھے جب ہندی سرکاری زبان قرار نہیں دی گئی تھی لیکن اس امر کا اظہار یقین کے درجہ تک کر دیا گیا تھا کہ اُردو کے مشترکہ زبان مانے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ اب ہندی اور اُردو زبانوں کے مقابلہ کے سلسلہ میں یہ بحث کرنا کہ انسانی جسم کا وہ عضو جس کو زبان کہتے ہیں الفاظ و عبارت کے ثقل و ضخامت کو برداشت نہیں کر سکتا دور از کار ہے۔ اس معنوں میں میں نے یہ عرض کیا تھا:-

"زبان الفاظ کے ثقل و ضخامت کو برداشت نہیں کر سکتی خواہ یہ کیفیتیں تکلم سے متعلق ہوں یا لہجہ سے یا کتابت سے۔ ثقیل اور ضخیم الفاظ یا تو استعمال کی کمی کی وجہ سے قطعاً متروک ہو جاتے ہیں یا جس طرح سنگریزے دریا میں لوٹتے پلٹتے چکنے اور صاف اور مختصر ہو جاتے ہیں اُسی طرح الفاظِ مذکور کثرتِ استعمال سے گھس گھسا کر دوسری مختصر شکل اختیار

کر لیتے ہیں۔"

سر دست اس بحث کو ہم صرف اُردو تک محدود رکھتے ہیں اور برنارڈ شا کے نکات و اشارات کی روشنی میں اس پر غور کرتے ہیں۔

کسی زبان کے بین لاقوامی زبان بننے کی اہلیت کا انحصار عبارت اور الفاظ کی سادگی اور اختصار پر ہے۔ جب اُردو خود ہندوستان کی زبان نہ بن سکی تو اُس کے بین الاقوامی زبان بنائے جانے کا خیال دل میں لانا بالکل عبث ہے۔ تاہم اگر اُردو بولنے والوں کی دُنیا اپنی زبان کو آسان تر کرنے کے لئے کوشش کرے تو کوئی بُری بات نہ ہوگی، اس بارہ میں یعنی ثقل و ضخامت کو کم کرنے کے سلسلہ میں میں نے عرض کیا تھا:۔

"ایک بات جو دھیان میں آتی ہے یہ ہے کہ عربی اور فارسی زبانوں کی جو لامحدود ڈکشنریاں ہمارے پیش نظر رہتی ہیں اُن کا دروازہ بند کر دیا جائے اور اپنی زبان کی لغات طیار کی جائیں۔ یہ لغات صرف ہندی بول چال کے الفاظ و محاورات تک محدود نہیں ہونا چاہئے بلکہ فارسی، عربی وغیرہ کے وہ الفاظ و محاورات بھی شامل ہونا چاہئے جو ہمارے روزمرہ اور عام بول چال میں داخل ہیں۔"

برنارڈ شا کی اس تجویز کی موجودگی یا اُس کے مقابلہ میں کہ انگریزی کو آسان بنانے کے لئے ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری کو دریا بُرد کر دیا جائے، میں نے اُردو زبان کی نئی ڈکشنری بنائے جانے کا جو خیال ظاہر کیا تھا وہ غالباً انوکھا نہ سمجھا جائے گا۔ مجھے یاد ہے کہ نگار کو مضمون بھیجنے سے قبل جب میں نے یہ مضمون چند احباب کو پڑھکر سنایا تھا تو وہ اُس کو سُنکر ہنس دئے تھے۔ اِسی طرح مضمون کے اُس حصہ کو سُنکر جس میں حروفِ تہجی کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، منہ بنا کر رہ گئے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بچوں کے سر سے بار کم کرنے اور اُردو کی جدید ڈکشنری بنانے کے لئے اُردو حروف میں ترمیم کی جائے۔ اور اُردو حروفِ تہجی میں سے ہم آواز حروف کم کر کے صرف ایک ایک حرف قایم رکھا جائے۔ اور کچھ نئے حروف اضافہ کئے جائیں۔

علماء اور فضلا کی جماعتوں اور افراد کو چھوڑ کر عام آدمی اور بچے کے لئے 'ث'، 'س'، 'ص'، سب ایک سی آواز رکھتے ہیں اس لئے اِن حرفوں میں آواز کے لحاظ سے کوئی تفریق نہ سمجھ کر سب کو ایک ہی آواز کے حرف قرار دینا واقعیت کے خلاف نہ ہوگا۔ میرے گھر میں دو چار بچے تختیوں پر لکھنے کی مشق کیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اُن کی تختیاں دیکھنے میں آجاتی ہیں، چنانچہ پندرہ بیس روز ہوئے کہ میں نے دو بچوں کی تختیاں دیکھیں۔ جُدا جُدا اُن دونوں نے لفظ "مضبوط" کو "مزبوت" سادہ صوتی تلفظ کے اعتبار سے لکھا تھا۔ وہ دیگر ہم آواز حروف کی اُلجھنوں میں نہیں پڑے املا کی اصلاح کا یہ اصول اجازت نہیں دیتا کہ ایک ہی آواز کے کئی کئی حرف ہوں۔ برنارڈ شا کا پیش کردہ اصول ہر زبان سے متعلق ہے نہ صرف انگریزی سے۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے متعلق میں نے عرض کیا تھا:-

"موجودہ حالات بدیں خود اور موسیٰ بدینِ خود کی طرف جا رہے ہیں۔ اس لئے اس اصلاح کا قبول کیا جانا ازبس مشکل نظر آتا ہے البتہ اگر حامیانِ اُردو موجودہ رسم الخط کی اصلاح کی طرف محض اپنی آیندہ نسلوں کی بہتری کے لئے توجہ دیں۔ نیز اپنی اُس جذباتی تخئیل کی ترمیم کے لئے آمادہ ہوں جو سامی یا ایرانی کلچر سے وابستہ ہے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

میرے مخاطب اس وقت صرف وہ لوگ ہیں جو اُردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔ بحالاتِ موجودہ اُنکا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ اُن کے پاس دولت ہے نہ حکومت۔ اس صورت میں اس قسم کی تجویزوں پر عمل کون کرے اور کیسے کرے، یہ بہت ٹیڑھا سوال ہے، آسان سی ترکیب تو وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف برنارڈ شا نے اشارہ کیا ہے۔ اُنھوں نے ظاہر کیا ہے کہ وہ خود ستر سال سے زاید صوتی تلفظ کے طریقہ پر لکھتے رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ افراد جن کو اُردو رسم الخط کی اصلاح سے دلچسپی ہو بجائے خود اپنی اپنی انفرادی حیثیت میں یا جہاں دو چار متفق الرائے ہوں تو باہم مل کر یہ تہیہ کر لیں کہ وہ اپنے بچوں کو صرف صوتی تلفظ سکھائیں گے اور اس کو آسان کرنے کے لئے وہ سب ہم آواز حروف میں سے ایک سہل حرف چُن کر باقی حرف خارج کر دیں گے۔ اگر دو چار شخصوں نے بھی ایسا تہیہ کر کے اپنے بچوں کو خود اس طرح سکھانا یا معلم سے تعلیم دلانا شروع کر دیا تو بہت ممکن ہے کہ عوام میں یہ طریقہ رواج پا جائے اور کسی آیندہ مدت میں مزید ترمیمات کے بعد اس نوبت پر پہنچ جائے کہ مجوزہ ڈکشنری بن سکے۔

اُردو حروفِ تہجی میں سے حروفِ ذیل قابلِ اخراج تصور کئے جا سکتے ہیں:-

ح - ط - ع - ص - ث - ذ - ہ -

اِن حرفوں کے خارج کر دینے سے اور الفاظ کو صوتی تلفظ کے اعتبار سے ہجا کرنے سے ہجا اور املا کی پیچیدگیاں رفع ہو جائیں گی، گو یہ مسلم ہے کہ اُردو میں بہت کم ایسے لفظ ہیں جن کا املا صوتی تلفظ کے مطابق نہیں ہے مثلاً عبد السبحان یا والسلام وعلی الصباح۔ بہرحال اگر متذکرۂ صدر حرف کم کر دئے جائیں تو جس طرح ہندی کی بارہ کھڑی سیکھ کر معمولی ان پڑھ لوگ اپنی معمولی زبان لکھنے پڑھنے لگتے ہیں اُسی طرح اُردو کے حروف پہچان کر اور اُن کو ملانا سیکھ کر لکھنا پڑھنا آسکے گا۔ جب تک کوئی تحریر صوتی تلفظ پر مبنی نہ ہوگی اور غیر زبانوں کے سیکھنے پر اُس کے جاننے کا انحصار ہوگا مادری زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ مادری زبان وہی ہو سکتی جس کے حرف پہچانتے اور اُن کو ملا کر پڑھنے کے طریقے سیکھنے ہی سے اُس زبان میں لکھنا پڑھنا آجائے۔ نہ یہ کہ اُس زبان کے جاننے کے لئے اجنبی یا غیر مانوس الفاظ کی دوسری زبانیں سیکھنا پڑیں۔

اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی تجاویز قبول کرنے سے زبانِ اُردو محض بگڑ ہی نہ جائیگی

بلکہ مٹ جائے گی۔

مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے خوف کا احساس چند روزہ ہوگا اور جب مجوزہ ترمیم کے مطابق لوگ لکھنے پڑھنے لگیں گے تو اعتراض خود بخود رفع ہو جائے گا۔ اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے کہ اس وقت بھی کتنے لوگ ایسے لفظ بولتے ہیں جو یا تو صحیح معنی میں لفظ ہی نہیں یا جن کا زیر و زبر کے لحاظ سے تلفظ غلط ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان غیر زبانوں کی لغتوں کی محتاج ہے نہ صرف اجنبی زبانوں کے الفاظ اور اُنکے معانی کے لحاظ سے بلکہ اُن کے طریق ہجا اور اجنبی لب و لہجہ کی پیروی کرنے کے لحاظ سے بھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم "تیار" کی جگہ "طیار" کیوں لکھیں۔ "باطل" یا "باطن" کو یا "بلعم باعور" کو عربی صوتی تلفظ کے ساتھ ہندوستان میں کون بولتا ہے۔ میرے ایک کرمفرما کپتان احمد خاں صاحب ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے زمانہ میں وہ مصر میں قیام رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے کسی دوکان سے کچھ سامان خرید کیا۔ دوکاندار نے اُن کا نام درج رجسٹر کرنے کے لئے دریافت کیا۔ کپتان صاحب نے اپنا نام احمد خاں بتایا لیکن دوکاندار کی سمجھ میں نہیں آیا۔ بار بار کہنے پر بھی وہ نہ سمجھ سکا۔ بالآخر ترجمان نے دوکاندار کی مشکل حل کی۔ بات یہ تھی کہ کپتان صاحب 'احمد' میں 'ح' کو 'اے' کے ڈھنگ پر بولے تھے اور 'د' کو اُس کے صحیح مخرج سے ادا کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ 'تیز' خان' کے 'نون' کو بھی اعلان کے ساتھ ادا نہیں کیا تھا۔

ح - ا

طوفانِ محبّت

حضرت ہوشؔ بلگرامی المخاطب بہ ہوش یار جنگ کی معیاری مثنوی۔ جس میں حُسن و عشق کی دلسوز داستان اس زبان اور لب و لہجہ میں بیان کی گئی ہے جس کو اب دُنیا ترس رہی ہے اور کہیں نہیں باقی۔

اس مثنوی کو وہ خصوصیت جو کسی اور مثنوی میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ اس میں مذہب و اخلاق کے نکات بھی انتہائی دلآویز رنگ میں بیان کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں فاضل مصنف نے مثنوی نگاری پر تاریخی و تنقیدی روشنی بھی ڈالی ہے اور حضرت نیازؔ فتحپوری کا ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:- "فنی محاسن اس مثنوی میں جابجا اتنے بکھرے ہوئے ہیں کہ نہ ان کو میں سمیٹ سکتا ہوں اور نہ وجدان ان کی وضاحت سے مطمئن ہو سکتا ہے"۔ ظاہری حُسن کے متعلق غالباً اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ وہ بہترین بیرونی ٹائپ میں چھپی ہے اور نہایت دبیز ولایتی کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

ضخامت ۲۹۸ صفحات۔ قیمت مجلد سات روپیہ۔ غیر مجلد پانچ روپیہ

ملنے کا پتہ:- سکریٹری نواب ہوش یار جنگ۔ سرفراز منزل۔ برکت پورہ۔ حیدرآباد۔ دکن

مسئلہ ازدواج

ذات اور ماحول میں ایک خاص قسم کے تطابق کا نام حیات ہے۔ جب تک اس تطابق میں توازن قایم ہے قوائے حیات نمو پاتے رہتے ہیں۔ توازن کی کیفیت جاننے کے لئے احساس کا آلہ ہوتا ہے۔ عوامل حیات افزا کا تعلق احساسات انبساط مسرت اور لذت سے ہے اور عوامل حیات فرسا کا تعلق انقباض و غم و الم سے ہے۔ لیکن عملی زندگی میں احساس کبھی بسیط حالت میں نہیں پایا جاتا بلکہ ہمیشہ کسی نہ کسی جذبہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس کو احساس مرکب کہتے ہیں۔

احساس مرکب دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو وہ جو اپنی تکوین کے لئے خارجی اسباب کا محتاج رہتا ہے۔ دوسرا احساس وہ ہے جو مہیجات کے وقوع کا حاجت مند نہیں رہتا ہے جس کو اصطلاح میں اشتہا سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دوسرا احساس بمقابلہ پہلے کے زندگی کے لئے لازم تر ہے۔ انھیں اشتہاآت کی فہرست میں بھوک، نیند وغیرہ کے ساتھ جذبات کا بھی نام آتا ہے۔ دوسرے جذبات کو روکا جا سکتا ہے۔ لیکن اشتہاآت کو نہیں روکا جا سکتا۔ غالباً اسی حقیقت کو مدنظر رکھ کر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروؤں سے یہ تو کہا کہ اگر تم کو کوئی ایک طمانچہ مارے تو دوسرا گال پیش کر دو، مگر یہ نہیں کہا کہ اگر تم کو کوئی رات کو سونے نہ دے تو ساری رات جاگتے رہو۔

مختلف اشتہاآت کا تعلق انسان کے دیگر شعبوں سے ہے۔ بھوک کا تعلق جسم و روح سے ہے۔ نیند کا تعلق دل و دماغ سے ہے اسی طرح جذبہ شہوت میں جو مرد اور عورت کے درمیان اتحاد تناسل کا ذریعہ ہے کافی احتیاط چاہتا ہے۔ عورت محض شہوانی تسکین کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس تسکین سے ایک نئی چیز پیدا ہوتی ہے جو حقیقت میں فطرت کا صحیح منشا ہے۔ فطرت وجود نوع کو وجود افراد پر ترجیح دیتی ہے۔ اکابر رجال چشم زدن میں نذر اجل ہو جاتے ہیں لیکن نظام کائنات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ افلاطون و ارسطو، کینٹ اور اسپنسر پیوند خاک ہو جاتے ہیں۔ لیکن فلسفہ کو موت نہیں آتی۔ سکندر و جولیس قیصر، تیمور و نپولین گزر جاتے ہیں لیکن دنیائے عسکریت کا خاتمہ نہیں ہوتا، شکسپیر و گیٹی، حافظ و غالب کے ذرات استخواں بھی آج نہیں ملتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا اسی طرح آباد ہے۔

غرض جہاں تک نظر کی جاتی ہے فطرت کے نقطۂ خیال سے انفرادی زندگی کی بجائے خود کوئی اہمیت و وقعت نہیں معلوم ہوتی بلکہ جو کچھ اس کی قدر و منزلت ہے وہ صرف اسی حیثیت سے ہے کہ وہ نوع کا تسلسل قایم کئے ہوئے ہے۔

اینٹ و پتھر بجائے خود کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتے بلکہ ان کی قدر و قیمت محض اس لئے ہے کہ وہ تعمیر مکان میں مدد دیتے ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وجود افراد مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ تخلیق نوع صحیح مقصد ہے، اسی فطری قانون کی بنا پر حیات نسلی کو حیات شخصی پر ہمیشہ فوقیت رہی ہے۔ والدین اپنی اولاد کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کچھ مصائب نہیں برداشت کرتے ہیں، بابر نے ہمایوں کی زندگی کے لئے اپنی زندگی قربان کر دی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیات نوعی فطرتاً ضروری ہے اور یہ حیات مرد اور عورت کے تناسلی اتحاد سے پیدا ہوتی ہے لیکن ازدواج ہی اس حیات کا کیوں ذریعہ ٹھہرایا جاتا ہے؟ کیا صرف ازدواج ہی سے حیات نوع کی تربیت ممکن ہے؟ یقیناً جواب اثبات میں ہوگا۔ جانوروں میں البتہ شہوانی خواہش پورا کرنے کے لئے ازدواج کی رسم نہیں —— جانور آزاد ہیں کہ وہ جس کسی سے بھی چاہیں اپنی جنسی بھوک کی آگ کو بجھا سکتے ہیں۔ لیکن آدمی جانور تو نہیں ہے اور نہ وہ ان کے ایسی زندگی بسر کرتا ہے۔ بقول ارسطو آدمی Rational being (ذی عقل جاندار) ہے۔ ریشنل ہونے کے لئے عقل و فہم و ادراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان میں یہ ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ اوصاف محبت و ہمدردی، قربانی و ایثار لطف و عنایت کے وسایل ہیں۔ انسان تمام مخلوقوں سے اعلیٰ اور افضل کیوں ہے؟ محض اسی لئے کہ وہ مندرجہ بالا اوصاف کا حامل ہے۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا کہنا ہے کہ خالق عالم نے انسان کو حیوانیت کی زندگی کے حدود سے باہر رکھا ہے جانور آزاد ہے اس کی ضروریات زندگی کسی کے امداد کی محتاج نہیں ہے۔ لیکن انسان زندگی کے ہر شعبہ میں دوسروں کی امداد کا طالب رہتا ہے۔ وہ تنہا اپنی ضروریات زندگی پورا نہیں کر سکتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ قدرتی چیزوں کی ہیئت تبدیل کر کے ان کو اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ انسان کے استعمال کی چیزوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ وہ بذات خود ان کو اپنی خواہش کے مطابق ترتیب نہیں دے سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپس میں اتحاد پیدا کرے، ایک دوسرے کی امداد کرے اور آپس میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرے۔ ورنہ دوسرا کیوں اس کی تکمیل خواہش میں ہاتھ بٹائے گا۔ اسی لئے انسان کو (معاشرتی حیوان) Social animal کہتے ہیں۔ انسان مجبور ہے کہ وہ سوسائٹی میں رہے۔ سوسائٹی میں رہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ سوسائٹی کے مقرر کردہ نظام کی پابندی کرے جس کے جواب میں سوسائٹی اس کی ہر آسایش کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

مندرجۂ بالا بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان فطرتاً ایک دوسرے سے ہمدردی اور انسیت پیدا کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمدردی اور انسیت انسان میں کیونکر وجود پاتی ہے۔ نفسیاتی فلسفہ کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ملکیت (Ownership) ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان میں ہمدردی و محبت، ایثار و قربانی کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔ لوگ دوسروں کی اولاد کے بالمقابل اپنی اولاد سے کیوں

زیادہ محبت کرتے ہیں ؟ صرف اسی لئے نہ کہ وہ اس کی اپنی اولاد ہے اور وہ اس کا مالک ہے۔ اولاد اس سے متاثر ہوتی ہے۔ اور اپنے والدین کی وساطت سے اس کو اپنے بھائی بہن، عزیز و اقارب، وغیرہ سے محبت اور ہمدردی ہو جاتی ہے۔ یہ تعلق کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اسے ساری دُنیا سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے ——— بین الاقوامی اتحاد اسی فطری جذبہ کا نتیجہ ہے۔ کائنات میں یہ رنگ و مہک، جذب و کشش، چہل پہل اور شان و طمطراق اسی فطری اُصول کی بنا پر قایم ہیں۔

سربازار ایک عورت بیٹھی ہے۔ اس کا کوئی وارث و مددگار نہیں ہے۔ اس کی زندگی صرف سوسائٹی کے نظام کی وجہ سے قایم ہے۔ ایک آدمی اپنے شہوانی جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے پاس جاتا ہے اور اپنی خواہش پوری کرتا ہے اس اختلاط سے اگر اس شخص کے دل میں مذکورہ عورت کے لئے کچھ ہمدردی پیدا ہوئی ہے تو محض اس لئے کہ وہ مکرر اپنی خواہش پوری کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس عورت کے پاس ہر شخص آجا سکتا ہے تو اس کی محبت نفرت میں بدل جاتی ہے۔ مردوں سے پیہم اختلاط کی وجہ سے کچھ روز بعد وہ عورت ایک بچّہ کی ماں ہو جاتی ہے۔ بچّہ کے والدین کون ہیں ؟ ماں تو ضرور ہے لیکن باپ کا پتہ نہیں۔ بچّہ فطرتاً باپ کی طرف زیادہ رجوع ہوتا ہے۔ صرف بوقت ضرورت اور خوف و ہراس کی حالت میں وہ ماں کی گود تلاش کرتا ہے۔ باپ اور صرف باپ ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ بچّہ میں انس و ہمدردی کے مادّے پرورش پاتے ہیں۔ دنیا کا یہ مشاہدہ ہے کہ باپ کی عدم موجودگی میں بچّے کی صحیح تربیت نہیں ہو پاتی ہے۔ بچّہ باپ ہی کی وساطت سے دنیا سے روشناس ہوتا ہے اور اس سے تعاون حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بچّہ کو ماں کے علاوہ باپ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور باپ بغیر ازدواجی زندگی کے مل نہیں سکتا۔ ازدواج مرد و عورت میں دیرپا اتحاد کا نام ہے۔ یہاں تک تو ازدواجی زندگی کی اہمیت کو باعتبار اصول ثابت کیا گیا ہے۔ اب عملی زندگی میں کشش ازدواج کا مشاہدہ کیجئے۔

ڈاکٹر ہکسلی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ اسے ایک نوجوان عورت سے محبت پیدا ہو گئی۔ عورت دق کے مرض میں مبتلا تھی۔ ڈاکٹر موصوف اسے ایک دوسرے ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس کی صحت کے بارے میں اس ڈاکٹر کی رائے دریافت کی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ یہ عورت بمشکل تمام چھ، سات ماہ زندہ رہ سکتی ہے۔ ہکسلی خود طب کا ماہر تھا۔ اگر وہ غور کرتا تو خود بھی اپنی محبوبہ کے متعلق اس ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق کرتا۔ مگر ازدواج کی کشش اس کے دل و دماغ، عقل و جذبات، غرض سارے قویٰ پر حکمرانی کر رہی تھی اور وہ ایسی صورت میں اس نوجوان مریضہ سے شادی کرنے کو تھا۔ اگر ڈاکٹر موصوف کی خواہش صرف شہوانی جذبہ کی تسکین تھی تو وہ بغیر ازدواج کے بھی اسے پوری کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اُس عورت سے شادی کر کے اس کو صرف اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا۔ دنیا ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جس میں کشش

ازدواج نے جذبات شہرت پسندی، غیرت وخودداری، حب زر و مال و فرض شناسی کی متحدہ قوت کو شکست دی ہے۔

محض ازدواج کی اہمیت اور کشش بیان کرنے سے مسئلہ ازدواج کا حل نہیں نکلتا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ازدواج کے لئے کون کون سی باتیں ملحوظ رکھنے کے قابل ہیں۔ فی الحال موجودہ دنیا میں چند ترمیم و تنسیخ کے ساتھ دو اصول رائج ہیں۔ (۱) ازدواج معاشقہ ۔ (۲) ازدواج مروجہ۔ ازدواج معاشقہ میں قبل شادی نوجوان مرد و عورت ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور ازدواج مروجہ میں ان کے والدین شادی کا معاملہ طے کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ازدواج کے وقوع پذیر ہونے میں محبت کا عنصر غالب رہنا چاہئے یا والدین کی رائے کو ترجیح دینی چاہئے۔

محبت کی شادی کو صرف یہ کہکر کہ دنیا میں اکثر و بیشتر ناکام ثابت ہوئی ہے بُرا نہیں کہا جا سکتا ہے ازدواج معاشقہ میں محبت کا جو رنگ رہتا ہے اس کی پوری ماہیت پر غور کرنا چاہئے۔ زمانہ قدیم سے لوگ کہتے آئے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ کیوپڈ نے تو محبت کو اندھا دیوتا کہا ہے۔ شیکسپیر کے خیال میں محبت کرنے والا مصری آنکھوں میں ہیلن کی خوبصورتی پاتا ہے۔ The Love finds the Helen's beauty in (her brow of Egypt-) ان دو بیانات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ محبت نام ہے اس شدید جذبہ کا جو انسانی عقل و فراست پر چھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جذبہ محبت ایک نعمت ہے۔ دنیا میں ایسے اشخاص گزرے ہیں جنھوں نے جذبہ محبت کی رہنمائی میں محیر العقل کام انجام دئے ہیں۔ لیکن عملی اور اعتدالی زندگی میں یہ جذبہ صحیح اور مناسب رہبری کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ دنیا میں زندگی کے ہر موقعہ پر عقل و فہم و ادراک کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان ان قوتوں کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی کس طرح گزار سکتا ہے۔

عموماً مرد و عورت کے مابین جذبۂ محبت کا محرک عورت کا ظاہری حسن ہوتا ہے۔ عورت کے حسن میں بے انتہا کشش ہے مرد بے تحاشا اس کی طرف کھنچ اُٹھتا ہے اور اس Feeling of affection جذبۂ انس کو وہ محبت سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس خوبصورتی سے محظوظ ہونے کے لئے بیچین ہو جاتا ہے اور اس بیچینی کو دور کرنے کے لئے شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ وہ اس وقت بھول جاتا ہے کہ شادی کے معنی دیرپا تعلق کے ہیں۔ فی الحقیقت اس کی یہ خواہش کسی اور وجہ سے ہوتی ہے۔ اس خواہش یا اشتہا کو جاننے کے لئے عورت کی ساخت پر نظر کرنی چاہئے۔ حسن کی تخلیق رنگت اور بناوٹ سے ہوتی ہے۔ لیکن اس میں جو جاذبیت اور کشش پیدا ہوتی ہے وہ دوشیزگی کی شراب اور جوانی کی اُمنگوں سے وجود میں آتی ہے۔ شراب دوشیزگی کا نشہ بعد شادی زایل ہو جاتا ہے اور عورت کی جاذبیت ختم ہو جاتی ہے۔ اب صرف جوانی کی کشش باقی رہتی ہے جو بقول دنیا ایک سریع الزوال شے ہے، جہاں جوانی کا دور ختم ہوا وہ ایک معمولی اور عام عورت ہو جاتی ہے جس میں نہ جاذبیت ہوتی ہے اور نہ کشش۔ اگر نتیجہ یہی ہو تو بھی محبت کی شادی اتنی تباہ کن نہ ہو لیکن اصول نفسیات بتاتا ہے کہ مرد کو اس حسین اور جوان عورت سے نفرت کا ہونا یقینی ہے۔

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جس چیز کی جتنی زیادہ خواہش ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ اس سے نفرت بھی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہش کی شدت تصنع اور ظاہری حسن تک محدود رہتی ہے صنعت گری کی خوبی اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ وہ انسان سے دور رہتی ہے۔ قبضہ میں آجانے کے بعد وہ چیز اپنی ساری کشش کھو دیتی ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انسان میں سیر ہونے کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے وہ بہت جلد کسی سے سیر ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی حال مرد و عورت کے مابین محبت کا ہے۔ مرد، عورت کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اپنی شہوانی پیاس بجھانا چاہتا ہے۔ جہاں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا پھر عورت کی خوبصورتی میں اس کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ برخلاف اس کے عورت کی فطرت دوسری ہے۔ اس میں چاہے جانے کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ مرد اسے چاہے۔ لیکن جب مرد ایسا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ آئے دن نفاق اور اختلاف بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کا وجود دوسرے پر گراں گزرنے لگتا ہے اور زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔

جذبات کی رو میں بہ جانا عقلمندی نہیں ہے۔ برنارڈ شا اپنے جذبات پر کبھی بھروسہ نہیں کرتا — اس کا خیال ہے کہ جذبات غلط راہ دکھاتے ہیں۔ انقلاب دُنیا کا اصول ہے۔ ہر چیز کی ہیئت بدلتی رہتی ہے۔ پھر انسان کیونکر جذبات کی روشنی میں اپنا سیدھا راستہ تلاش کر سکتا ہے۔

مرد کی محبت بہت جلد فنا ہو جاتی ہے۔ ازدواج معاشقہ میں مرد کی محبت کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محبت کی شادی کا رشتہ کتنا کمزور ہوتا ہے۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے اور عورتوں کو بھی مکمل آزادی دی جائے تو معلوم ہوگا کہ دُنیا صحیح ازدواج معاشقہ سے عاری ہے۔

جنسی احساس کے اعتبار سے بھی مرد و عورت میں بہت تضاد ہے۔ مرد کی نظر عورت کی خوبصورتی پر پہلے پڑتی ہے جس سے اس میں شہوانی جذبہ اُبھرتا ہے۔ بعد ازاں وہ اس کی تندرستی مال و دولت پر نظر کرتا ہے۔ نسل کا خیال اگر آتا بھی ہے تو سب سے اخیر میں آتا ہے۔ برخلاف اس کے عورت کی نظر اولین مرد کی توانائی پر جاتی ہے، بعد ازاں اسکی نظر اور باتوں پر پڑتی ہے۔ مرد کے ظاہری حسن کا خیال تو بہت بعد میں آتا ہے، اس نظریہ کے تحت اگر مرد و عورت کو کامل آزادی ہو تو مناسب زن و شوہر مل سکتے ہیں؟ — بلاشبہ جواب نفی میں ہوگا۔ عورت کی فطرت قدرتاً مغلوب ہے۔ آسانی سے اس کی فطرت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن مرد کی فطرت مغلوب نہیں ہے وہ خود دوسروں کی فطرت کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ مرد جسمانی، مالی، ذہنی اور نسلی حالت سے پست ہی کیوں نہ ہو وہ ایک (Ideal) آئیڈیل عورت کا متمنی رہتا ہے۔ وہ اپنی شدت محبت کی وجہ سے عورت کو پوجتا ہے۔ [illegible] کرتا ہے لیکن انصاف کے معنی تو یہ نہیں ہوئے، اگر بالفرض محبت میں کسی دباؤ یا خارجی اسباب کا اثر نہ بھی ہو تو بھی قانون محبت کے لحاظ سے ان کے توقعات میں بعید وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اثرات یکجائی دونوں کو اس قدر حساس بنا دیتے ہیں کہ اگر توقعات کی بے پایاں وسعت میں ذرا

بھی ناگوار واقعہ کی دراندازی ہوتی ہے تو ایک دوسرے کے طرزِ عمل پر تنقید ہونے لگتی ہے۔ محبت کب اس کی متحمل ہوسکتی ہے۔ ناز و نیاز کا قانون ہی علٰحدہ ہے۔ جس میں سپردگی اور پاس فرایض کی گنجایش نہیں۔

زندگی کے جس دور میں انسان پر شہوانی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کی عقل دور تک نہیں پہونچتی ہے۔ لہذا چند دنوں کی خاطر ساری دُنیا کو ناخوشگوار بنانے کے لئے ازدواج کا فیصلہ مرد و عورت پر نہیں چھوڑنا چاہئے، بلکہ اس میں ان لوگوں کا ہاتھ ہونا چاہئے جن کا فیصلہ جذبات کے بجائے عقل کی روشنی میں ہوتا ہو اور جن کی نظر حال و مستقبل پر یکساں پڑتی ہو، اس کے لئے والدین اور عزیز و اقارب سے بہتر کون ہوسکتا ہے۔ وہ لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات، خیالات و احساسات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں جو ہر نوع سے لڑکے اور لڑکیوں کی بھلائی دیکھتے ہیں لہذا ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا فیصلہ والدین پر چھوڑ دیا جائے۔ مرد و عورت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی رائے سے والدین کو باخبر رکھیں۔ ایسی مثالیں بہت کم ہیں جبکہ والدین کسی حرص و طمع کے دام میں پھنس کر لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی برباد کردی ہو۔ والدین کے لئے مناسب ہے کہ وہ لڑکے اور لڑکیوں کی رائے دریافت کریں۔ مگر ان کی رائے پر عمل کرنا ان کے لئے ضروری نہیں ہے۔ اگر ان کی رائے صائب اور مناسب ہے تو والدین کو اس پر عمل کرنے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ ایسی شادیوں میں محبت صحیح رنگ اختیار کرتی ہے اور چونکہ یہ محبت اسباب کی بنا پر ہوتی ہے اس لئے دیرپا ہوتی ہے۔

اسداللہ خاں

"تنقیدی اشارے" کا تازہ اڈیشن

پروفیسر آلِ احمد سرور۔ ریڈر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے اُنیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے صفِ اول کے نقادوں میں سے ہیں اور انکے تنقیدی مقالات سندی حیثیت رکھتے ہیں۔ مقالات کی فہرست یہ ہے:-

اُردو ناول کا ارتقا — اُردو میں فسانہ نگاری — اُردو میں خمریات — خطوط میں شخصیت — انگریزی شاعری۔ ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ — اکبر، شخصیت اور آرٹ — چکبست لکھنوی — اقبال اور ان کا فلسفہ — نائی جیولی۔ رتن ناتھ سرشار — ہندوستانی ادب میں آغا حشر کا درجہ — سرسید کے خطوط — مکاتیب مہدی — خنداں — جدید اُردو تنقید — حیات شبلی — مجھے کون کونسی کہانیاں پسند ہیں ——— اس اڈیشن میں پچھلے اڈیشنوں سے کافی اضافہ کیا گیا ہے — ۲۳۲ صفحات - کاغذ ۸ پونڈ - مجلد مع رنگین گرد پوش - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

جنگِ آزادی میں اُردو کا حصّہ

آزادی کا مفہوم اور اس کی تعبیر بڑا مباحثہ انگیز مسئلہ ہے۔ ہر دور میں اس کی مختلف تفسیریں ہوتی رہی ہیں۔ اسی لئے ادب میں بھی، زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ، اس کا تصور بدلتا رہا ہے۔ ان تبدیلیوں کا دامن، سماج کے ساتھ بہت مضبوط بندھا ہوا ہے۔ اور ادب سماج کی ان ہی ضروریات اور اُس کے عمومی رجحانات کا تابع ہے۔ ہمارے افکار و خیالات کی تشکیل میں بھی یہی ماحول اور معاشرہ ہے جو اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے عہدِ گزشتہ کے کارناموں اور ان کی روح کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان تاریخی قوتوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے جن کی بدولت ادب وجود میں آتا ہے، یا جن سے انسانی تمدن کا ایوان طیار ہوتا ہے۔ عہدِ گزشتہ کے ادب کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی بالعموم اسی وجہ سے کہ ہم ان کارناموں کو ان کے سماجی پس منظر سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ اور سماج کے عمل کو نظر انداز نہ کریں تو معلوم ہوگا کہ خواجہ میر دردؔ کے کلام میں جو آزادی کا تصور ہے وہ آج کے تصور سے بالکل مختلف ہے اس لئے کہ اسے مختلف ہونا چاہئے تھا۔ وہ اخلاقی و روحانی ہے۔ سیاسی و معاشی نہیں۔ یا میر کی شاعری میں جو انسان دوستی اور آزادی کی مخصوص لے ہے وہ یکسر جذباتی اور انفرادی ہے، اجتماعی نہیں۔ اس دور کا تقاضا ہی یہ تھا، وہ نے انفرادی ہی ہو سکتی تھی، اجتماعی نہیں۔

اُردو شاعری کو اُس وقت عروج حاصل ہوا جب ہماری زندگی کی تھکی ہوئی اور سسکتی ہوئی قوتیں، تصوف کے دامن میں پناہ لے رہی تھیں۔ شعرائے قدیم میں، مذاق تصوف وراثتاً موجود تھا، بعض باقاعدہ مرید تھے، اور بعض فارسی کی تقلید میں، مضامینِ تصوف پر خامہ فرسائی کرتے تھے۔ ولی شیوخ قادریہ میں سے تھے اور دلی کے مشہور بزرگ شاہ سعد اللہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، شاہ مبارک آبروؔ، شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے اور مرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر دردؔ شاعری کے علاوہ، دولت فقر سے بھی مالا مال تھے۔ غرض یہ سلسلہ سراج اورنگ آبادی سے لیکر اصغر اور جگر تک قایم رہتا ہے۔ ان شعرا کے یہاں آزادی کا ایک خاص انفرادی نظریہ ملتا ہے۔ یہ لوگ شریعت کی پابندیوں، دنیاوی نمائش اور ریاکاری کے مخالف ہیں اور حصولِ دولت و اقتدار سے بیزار۔ یہ روحانی آزادی حاصل کرنے کے لئے آتشِ نمرود میں کودنے کے لئے طیار ہیں اور دار و رسن کی جلوہ طرازی کے لئے آمادہ۔ یہ سنگ طور سے ایک نیا کسبِ یک تجربے تصور بنانا چاہتے ہیں۔ اُن کا مطمحِ نظر وسیع ہے، اور اُن کی ہمدردیاں بے پایاں۔ وہ انسان

کی مجبوریوں اور تکلیفوں پر آنسو بہاتے ہیں اور علی الاعلان کہتے ہیں کہ ــ "دُنیا سمٹ آئی ہے مرے دیدۂ تر میں"۔ شوق کی یہ شدت کہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے سطحی امتیازات اُٹھ جائیں، اور خیال کی یہ وسعت کہ ساری انسانیت اُس میں سما جائے معمولی بات نہیں ہے۔

اٹھارھویں صدی میں ہماری خارجی زندگی میں زبردست انقلاب رونما ہوا، جنگ پلاسی (۱۷۵۷) کے بعد انگریزوں کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔ اور انھوں نے رفتہ رفتہ سارے ملک پر اپنا اقتدار قایم کرلیا۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلّی تک پہونچ گئیں اور شاہِ عالم ثانی بالکل انگریزوں کے زیرِ اثر آگیا۔

تقریباً اسی زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی مہتم بالشان تحریک شروع کی۔ یہ تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی معاشی بھی اور ادبی بھی۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں میں وہ سچا مذہبی جذبہ باقی نہیں رہا ہے جو انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے اور جو سماج اور ملک کے فایدہ کو اپنے ذاتی فایدہ پر ترجیح دیتا ہے۔ اس جذبہ کو وہ خدا پرستی اور تربیت نفس کے ذریعہ اُبھارنا چاہتے تھے۔

اِس تحریک کا سیاسی مقصد بھی تھا اور وہ یہ کہ ملک کو انگریزوں سے پاک کرکے ایک ایسی جمہوری حکومت قایم کی جائے، جس میں چھوٹے اور بڑے، غریب امیر سب بلا قید مذہب و ملت برابر کا حصہ لے سکیں، شاہ صاحب سیاسی آزادی کے ساتھ اقتصادی نظام میں بھی تبدیلی چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں[1] میں جا بجا اس بات پر زور دیا ہے کہ مزدوروں اور کاریگروں کو ان کے صحیح حقوق دلائے جائیں اور ان کے اوپر کم سے کم بوجھ رکھا جائے۔

اِس تحریک کی ادبی نوعیت بھی ہے، جس کی طرف افسوس یہ ہے کہ بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ شاہ صاحب نے قرآن شریف کا سب سے پہلا فارسی ترجمہ کیا اور یہ ایک ایسا انقلابی اقدام تھا کہ اس سے حکومت کے ایوان میں زلزلہ آگیا اور اسی کے اکسانے پر جاہل عوام اور برخود غلط مولوی ننگی تلواریں لیکر شاہ صاحب پر ٹوٹ پڑے۔ ان کو اس سلسلہ میں وہی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں جو جان و کلف اور اس کے ساتھیوں کو انجیل کے ترجمہ کرنے پر اُٹھانا پڑی تھیں۔ آخر میں نجف خاں نے شاہ صاحب کے ہاتھ کٹوا دئے تاکہ وہ لکھ کر اپنے خیالات کی اشاعت نہ کرسکیں اور اُن کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سلطنت سے باہر نکلوا دیا۔ لیکن ان سختیوں سے یہ تحریک دب نہ سکی، اور ۱۸۰۳ء میں شاہ رفیع الدین کا اُردو ترجمۂ قرآن بھی مکمل ہوگیا۔

رتن لال ہنسل نے لکھا ہے :۔ "بدیشی قوموں کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے ہندوستان کو بچانے کے لئے شاہ ولی اللہ زندگی بھر لڑتے رہے اور اپنے وارثوں، بیٹوں، ناتیوں اور ہزاروں شاگردوں کے دل میں ایسی آگ چھوڑ گئے کہ انھوں نے مرجانا پسند کیا، پر ہندوستان کی غلامی کو چپ چاپ برداشت نہیں کیا"۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ دیوبند و بازغہ۔ و نیز رسالہ پیشوا، شاہ ولی اللہ نمبر

شاہ ولی اللہ کے رفقاء اور اعزا کی بدولت جن میں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر شاہ عبدالقادر، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید ہیں، اُردو نثر میں گراں قدر اضافے اور ترجمے ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتابیں مذہبی حیثیت رکھتی ہیں لیکن وہ چونکہ عوام کے فایدے کے لئے صاف اور سلیس زبان میں لکھی گئی تھیں، اس لئے اُن سے اُردو کو تقویت پہونچی اور اس طرح جدید نثر کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔

اس اصلاحی تحریک نے وہ آزادی، جرأت اور بیباکی بھی پیدا کی، جو اس سے پہلے اُردو ادب میں نہیں ملتی۔ شاہ اسماعیل شہید اور مرزا غالب کے راستے مختلف تھے لیکن جس آزادی اور بیباکی سے شاہ صاحب نے مذہب رسوم اور معاشرت میں تقلید کے خلاف جہاد کیا ہے اور عام اصنامِ خیالی کو توڑا ہے، اسی آزادی سے مرزا غالب نے فنِ لغت اور فنِ شعر میں بڑے بڑے اُستادوں پر نکتہ چینی کی اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وحی و الہام نہیں ہے اور نہ "ہر پرانی لکیر، صراطِ مستقیم ہے"۔ حزیں کے ایک مطلع پر اعتراض کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:۔

"حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے، تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے"۔ ۔ ۔ حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جانو" (تفتہ کے نام خطوط غالب ص ۲۳)

مولانا حالی اور ڈاکٹر رام بابو سکسینہ دونوں اِس بات پر متفق ہیں کہ سرسید کے یہاں بھی جو آزادیٔ خیال اور جرأت گفتار ہے، اس کا سرچشمہ بھی دراصل مولانا اسماعیل شہید کی تحریریں اور تقریریں ہیں۔ اس تحریک کے اثرات کتنے دور رس تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شاہ عبدالقادر دہلوی کے شاگرد شاہ عبدالعزیز کی مجالس وعظ کے حاشیہ نشین، مولوی سید احمد بریلوی کے مرید اور شاہ اسماعیل شہید کے ہم سبق۔ یعنی مومن خاں مومن دہلوی جب غزلیں لکھتے ہیں تو اس انداز کی "کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" وہ کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے کے لئے آمادہ ہیں اور شبِ وصل وغیرہ کاٹنے کے لئے طیار۔ لیکن جب وہ عام سطح سے بلند ہوتے ہیں تو اتنے کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصلِ ایمان اور اپنی جان کو اس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں:۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں، — مری جان فدا ہو تری راہ میں (مثنوی جہادیہ)

ایک فارسی قصیدہ میں جو عرفی شیرازی کے طرز میں لکھا ہے، فرماتے ہیں:۔

این عیسویاں بلب رساندند — جان من و جاں آفرینش،
تا چند بخواب ناز باشی — فارغ ز فغاں آفرینش
مومن شد و ہم زبانِ عرفی — از بہرِ اماں آفرینش

برخیز کہ شور کفر برخاست اے فتنہ نشاں آفرینش

آزادی کا یہ تخیل، مذہب کے چشمہ سے پھوٹا ہے بالکل ایسے ہی جیسے انگلستان کی آئینی جدوجہد مذہبی نزاع سے شروع ہوئی لیکن یہ محض خاکستر نہیں ہے۔ اس میں اضطراب کی بہت سی چنگاریاں روشن ہیں۔

غدر، ہماری تاریخ کا عہد آفرین واقعہ ہے۔ اس جہاد آزادی میں بہت سے طبقے شریک نہیں ہوئے۔ اور اُن کی عدم شرکت کے بہت سے تاریخی اسباب ہیں، تاہم یہ ہندوستانیوں کا سب سے پہلا متحدہ محاذ تھا جو انھوں نے انگریزوں کے خلاف پیش کیا، اسے آزادی کی جدوجہد میں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ناممکن تھا کہ یہ واقعہ ہمارے ادب و اہلِ ادب پر اثر انداز نہ ہوتا۔ بعض ادیب اور شاعر باقاعدہ اس جنگ آزادی میں شریک رہے، یوں بھی اُردو میں سپہ گری اور شاعری میں نُعد اور قصاد کبھی نہیں رہا۔ (ملاحظہ ہو تذکرہ نکات الشعرا ص ۴۵، ۷۴ و ۱۲۵) بعض نے قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں اور بعض کو "بغاوت" کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

فاضل عصر امام بخش صہبائی، دلّی کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ گارساں دتاسی نے ان کی تین کتابوں کا ذکر کیا ہے:۔ حدائق البلاغت، انتخابات نظم اور قواعد اُردو۔ حدائق البلاغت کہنے کو ترجمہ ہے" ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ اُردو میں اس فن کی پہلی مکمل اور مستند کتاب ہے[۵]۔ مرزا غالب بھی، صہبائی کے قدردان تھے۔ اُنھوں نے مومن و نیّر و صہبائی و علوی کا ذکر ساتھ ساتھ ہی کیا ہے، سرسید بھی اُنکے ارادت مندوں میں سے تھے۔ آثار الصنادید میں اُنھیں صہبائی سے کافی مدد ملی، جس کا اُنھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ یہ صہبائی اور اُن کے دو بیٹے، غدر کے الزام میں توپ سے اُڑا دئے گئے اور ان کی لاشیں دریا میں پھکوا دی گئیں۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اُن کے فارسی مرثیہ کے یہ اشعار جو سفینۂ رحمانی میں درج ہیں، آج بھی درد کی ایک ٹیس پیدا کر دیتے ہیں:۔

ندانم کجا رفت آں نعش پاک ملک بر دیا ماند بر روے خاک
ندانم کسے داد را کفن، دیا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کرد است با او سپہر ز جامہ کفن کرد یا تاب مہر
بخاکش نمودند او را نہاں دیا مرتفع شد سوئے آسماں
کسے فاتحہ ہم بر و خواندہ است بعطر گلابی بر افشاندہ است
کدامی گل و بلبل دبا دوشت بخاکش بحسن عقیدت گزشت
الٰہی بیامرز مظلوم را کلاہ شہی دہ بہ ملک بقاء
بفردوس اعلیٰ بود جائے او بہشت بریں باد ماوائے او

مولانا فضلِ حق خیر آبادی علمی قابلیت میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کو فتوائے جہاد کی پاداش اور جرم بغاوت میں انڈمان بھیج دیا گیا وہاں بڑی بڑی ذلیل خدمتیں اُن کے سپرد ہوئیں۔ آخر وہ ان مصائب کو برداشت نہ کر سکے اور وہیں سپردِ خاک ہوئے[1]۔

مولانا فضلِ حق کا یہ احسان اُردو دُنیا کبھی بھی نہیں بھلا سکتی کہ وہ مرزا غالب کی ادبی اور شعری تربیت کے لئے استاد کامل ثابت ہوئے۔ اور انھوں نے مرزا کو بیدل کی تقلید سے باز رکھا۔ غالب کے منتخب دیوان ریختہ کے متعلق آزاد کا بیان ہے[2] کہ یہ انتخاب مولانا فضلِ حق اور مرزا خانی کوتوال دہلی نے کیا ہے۔ یہ انتخاب مجموعی حیثیت سے لاجواب ہے۔ اور اس میں مزید اضافہ کی گنجایش نہیں۔

مفتی صدرالدین آزردہ جو فارسی و اُردو کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے، (بقول غالب) "بہت دیر حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط۔۔۔۔۔ لیفٹیننٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی"۔ (۱۸۵۷ء)

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے: "مفتی صاحب کا دیوان خانہ، دہلی کے منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا، جاڑا گرمی برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا"[3]

"دلّی اُسوقت آج کی سی دلّی نہ تھی۔ خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ باہم جمع ہوتے ہوں گے تو" بقول صاحب گلِ رعنا، "آسماں کو بھی زمیں پر رشک آتا ہوگا"۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو بغاوت کے الزام میں سات سال کی قید کا حکم ہوا۔ وہ اُردو اور فارسی کے بڑے خوش فکر شاعر تھے، ان کا تذکرہ گلشنِ بیخار اپنے اعتدال، توازن اور انصاف پسندی کی وجہ سے ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا غالب کو ان سے بے انتہا محبت تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "مصطفےٰ خاں کا حال سُنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں"۔

منشی محمد اسمٰعیل حسین میرٹھی شکوہ آبادی نے غدر میں بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا تھا، ان کو بالآخر قید کر کے انڈمان بھیج دیا گیا۔ وہاں ان پر جو تکلیفیں گزریں، ان کو انھوں نے ایک قطعہ کی صورت میں پیش کیا ہے:۔

---

[1] "مولانا فضلِ حق"۔ دارالمصنفین علیگڈھ۔ ہمارے علماء کا شاندار ماضی اور غدر کے علماء: مکتبۂ ادب"

[2] آبِ حیات۔ ص ۵۲۱۔ [3] غالب۔ مہر ص ۲۹۰۔

فرخ آباد اور یارانِ شفیق — چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے ہم — سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثل قبر، — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے — ظلم سے، تلبیس سے، تزویر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم — ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں — گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں — ناتواں ترقیس کی تصویر سے

تیرہ سات برس کے بعد انڈمان سے رہا ہوئے۔ یہ زمانہ انھوں نے کس مصیبت سے گزارا اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے رہائی کی خوش خبری سُن کر لکھے تھے :-

رخصت اے دوستانِ زندانی — الفراق اے ہجوم ناچاری
دال چاول سے کہدو رخصت ہوں — پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری
مچھلیوں سے کہو کہ ہٹ کے مٹریں — گھاس کھودے یہاں کی ترکاری
چینی، برمی، ملائی، مدراسی، — اہلِ آسام، جنگلی، تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں — اپنی باتوں سے دیں سبک باری
کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت — اشک شادی ہیں آنکھوں سے جاری
بیٹھتے ہیں جہاز دودی پر — اُٹھتے ہیں لنگرِ گراں باری
نکلے دریائے شور سے صد شکر — بحرِ شیریں کی آگئی باری
نظر آیا سوادِ کلکتہ — شکر ہے شکر حضرتِ باری

— خواجہ احمد فاروقی

دُنیائے مقویات میں ایک بےمثل خاص ایجاد

برقی قرص

ضعیف الاعصاب نازک طبع لوگوں کی مایوسی دور کرنے والا۔ کمزور اعصاب میں فی الفور برقی لہر دوڑنے والی سہل الترکیب نہایت معطر اور زود اثر دوا ہے جس کو اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے لوگ اکثر اپنے ہمراہ رکھتے ہیں۔ اور مکمل ۱۴ یوم کے استعمال سے ہر قسم کی کمزوری اور ناکارہ پن دور ہو جاتا ہے۔ سوزش، جلن وغیرہ کی تکالیف سے پاک ہے۔ قیمت مکمل کورس پانچ روپئے آٹھ آنے۔ نمونہ ایک روپے آٹھ آنے۔ محصول ہر حالت میں بہ ذمہ خریدار۔ **مطب حکیم ظہیر الحسن (میونسپل کمشنر) متھرا (یو۔پی)**

فرائیڈ، روحانیت اور اشتراکیت

اس میں شک نہیں کہ فرائیڈ نے بیسویں صدی میں ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد ڈالی اور وہ دُنیا کی فکری رو کو ایک نئی سمت میں موڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ ادب، فلسفہ، سیاسیات اور طب پر اس کی قابلیت کے بہت گہرے اثرات ہیں اور روز بروز زیادہ گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دُنیا اور بالخصوص اس کے معاندین نے اس مفکر کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اور اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اسنے جنسی جذبہ کو کوئی راز بنا کر نہیں رکھا اور اس کے اثرات کو ایک سائنسداں کی حیثیت سے واضح کر کے دکھا دیا۔

دُنیا نے اپنی کوتاہ عقلی کی بناء پر اس کو پستی کی طرف لیجانے والا اور ننگ انسانیت قرار دیا۔ حالانکہ اگر وہ اس مفکر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انھیں پتہ چل جاتا کہ وہ جنسی بے راہ روی کو اپنا مسلک قرار نہیں دیتا۔ بے شک اس نے جنسی تعلقات کو اسی تشریح کے ساتھ بیان کیا جس طرح ہم کھانے پینے، سونے اور تفریح کرنے کے متعلق گفتگو کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کوئی بُری بات نہیں بشرطیکہ اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اس جذبہ کو قابو میں رکھنے والی قوتیں بھی موجود ہیں۔ مذاہب عالم نے بھی یہی بتایا ہے کہ شہوت پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ البتہ فرائیڈ نے یہ ضرور کیا کہ اس نے قوتِ شہوانیہ کو قابل مذمت نہیں قرار دیا اور نہ میرے خیال میں وہ قابلِ مذمت ہے، ہاں اگر کوئی چیز قابل مذمت ہوسکتی ہے تو وہ اس کا بیجا استعمال ہے اور فرائیڈ بھی یہی کہتا ہے۔

انسان کو جتنی قوتیں ملی ہیں ان سب کا بیجا استعمال بُرا ہے، مثلاً جسمانی طاقت کو لیجئے کہ اگر کوئی انسان کسی کا خون کر ڈالے تو اس کو کون اچھا کہے گا لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ جسمانی قوت بہت بُری چیز ہے۔

علاوہ اس کے فرائیڈ کے معترضین اگر خود ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۲ء تک کے "خطبات فرائیڈ" کا مطالعہ کریں گے تو انھیں ہر خطبہ میں ایک تذبذب اور ایک بے یقینی کی جھلک موجود ملے گی اور انھیں پتہ چلے گا کہ خود خطیب اپنی کسی تحقیقات کو قطعی نہیں قرار دیتا۔ وہ ایک مسئلہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور اپنے مخصوص طرز استدلال سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے اپنی کم علمی اور کوتاہیوں کا بھی علم ہے جن کا اقرار کرنے سے وہ نہیں شرماتا لہذا ہم کو اس شخص کی ذہنی دیانت داری میں بھی شبہ نہیں رہ جاتا اور یہی وہ انداز تحقیق ہے جو خالص علمی کہلانے کا مستحق ہے۔

بہر حال یہ تو جملہ ہائے معترضہ تھے، دراصل اس مقالہ میں ہمارے پیشِ نظر "فرائیڈ بحیثیت ایک مفکر" کے ہے ظاہر ہے کہ اس کی مفکرانہ حیثیت مقرر کرتے وقت ہمیں اس کی تحریروں پر جو خطبات کی شکل میں ہیں انحصار کرنا پڑیگا۔

فرائیڈ کا خیال ہے کہ تحلیل نفسی بھی سائنسی علوم کی ایک شاخ ہے۔ اور اس کا مقصد بھی انسانی معلومات کو عقل کی ترازو میں تولنا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ فرائیڈ عقل کی رہنمائی سے مطمئن ہے۔

مذاہب کے متعلق اس کی تنقید کوئی قطعی حیثیت نہیں رکھتی وہ اگر ایک طرف خدا کے وجود کا منکر ہے تو دوسری طرف دبی زبان سے اس کے وجود کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ خدا کے وجود کی جو تفسیر وہ کرتا ہے وہی صحیح ہے۔

اسی طرح مابعد الطبیعیاتی مسایل کا ذکر کرتے وقت وہ یقین دلاتا ہے کہ روحانیات کے متعلق اپنے تیس چالیس سالہ دوران تحقیق میں وہ ایسے واقعات سے ضرور دوچار ہوا ہے جن کو عقلی دلایل سے ثابت کرنا ناممکن ہے، پھر بھی ایسا زمانہ ضرور آئے گا جب عقل انسانی ان دقیق مسایل کو جو فی الحال روحانی کہلانے کے مستحق ہیں، حل کرلے گی اور اُن واقعات اور ان کے نامعلوم اسباب کے درمیان علت و معلول کا رشتہ قایم کیا جاسکے گا۔ چنانچہ وہ اس بات کا بھی مقر ہے کہ ایک شخص جو کسی سے جذباتی طور پر وابستہ ہے اپنے خیالات بلا کسی مادی ذریعہ کے دوسرے کے ذہن میں منتقل کرسکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے محبوب کے متعلق یا ایک ماں اپنے دور افتادہ بچے کے متعلق فکرمند ہے تو ان خیالات کا اثر اُن کے ذہن پر پڑ سکتا ہے اور یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ دو شخص بیک وقت ایک دوسرے کے بارے میں ایک ہی بات سوچ رہے ہوں۔

۱۹۳۲ء میں جب فرائیڈ نے اس مسئلہ پر اپنے ایک خطبہ میں بحث کی تو ٹیلی پیتھی کا کوئی سنجیدہ آدمی مقر نہیں تھا لیکن فرائیڈ نے اپنی ذہنی راست بازی کی بناء پر اس مسئلہ کی اہمیت اور واقعیت کو تسلیم کیا۔ پھر اس کے بعد اہلِ مغرب (مشرقی ہی نہیں) اس پیچیدہ مسئلہ کی تحقیق میں مصروف رہے۔ اور اس وقت تک بے شمار کتابیں اس قسم کے واقعات کی شایع ہوچکے ہیں جو معمولی اشخاص کی تصنیف نہیں ہیں بلکہ اُن ماہرین طب کی لکھی ہوئی ہیں جو یورپ کی شہرہ آفاق یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے چکے ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ حال ہی میں رائٹر (Reuter) کی ایک رپورٹ کے مطابق لندن کا ایک شخص کئی میل کے فاصلہ پر بیٹھی ہوئی اپنی بیوی کو ایک خبر بھیجنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ خبر ایک ایسی کتاب کی چند سطور تھیں جو اس شخص کو بطور تجربہ دی گئی تھیں اور جس کی موجودگی کا اس کی بیوی کو کوئی علم نہ تھا۔

جہاں تک سائنس کا سوال ہے میرا خیال ہو کہ وہ بھی اس قسم کے حادثات کے بار بار وقوع میں آنے کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں کرسکتی کیونکہ یہ مثالیں ایک دو نہیں، ہزاروں کی تعداد میں اور ہر ملک و نسل کے لوگوں میں مل سکتی ہیں، مشرق تو خیر اپنی روحانی خصوصیات کے لیے بدنام ہی ہے لیکن مغرب کا سائنس زدہ دماغ بھی اِن واقعات کی شہادت دیتا ہے

اور فرائیڈ کا ہماری موجودہ اور آیندہ نسلوں پر یہ احسان ہے کہ اُس نے ان واقعات کو بے اصل اور حماقت آمیز نہیں قرار دیا بلکہ ان کی واقعیت کا اقرار کر کے ہماری نگاہوں کو ایک مخصوص سمت کی طرف موڑ دیا۔

فرائیڈ مذاہب کی روحانی حقیقت کو ماننے سے اس لئے انکار کرتا ہے کہ مختلف مذاہب صرف اپنے کو صحیح اور برحق اور دوسروں کو غلط قرار دیتے ہیں۔ فرائیڈ خود کہتا ہے کہ اس کی رائے مذہبی مسایل پر کوئی اہمیت نہیں رکھتی —— کیونکہ وہ ایک سائنسداں ہے اور اُسے مذہبی معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں۔

وہ عقل کی برتری کا قایل ہے اور مذہب و خدا کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے۔ وہ دُنیا میں صرف دو سائنسوں کے وجود کا قایل ہے ایک تو نفسیات اور دوسری نیچرل سائنس نفسیات کے تحت میں پوری سوشیالوجی کو رکھتا ہے اور نیچرل سائنس میں طبیعیاتی کیمیاوی اور دوسری بے جان اشیاء سے متعلق تمام علوم کو۔ ہمیں بڑی حد تک فرائیڈ سے اتفاق ہے کہ تمام سماجی علوم کو نفسیات کے تابع ہونا چاہئے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے استعمال سے ہماری اقتصادیات، سیاسیات، معاشیات، ادب اور دیگر فنون لطیفہ راہ راست پر قایم رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ انسانی طبایع کے اختلاف اور عادات کو سمجھنے کی اہلیت کسی اور علم میں نہیں ہے۔

یہی وہ نظریہ حیات ہے جو فرائیڈ کو اشتراکیت اور اشتراکیوں کی مخالفت پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اشتراکیت کی مخالفت اس بناء پر کرتا ہے کہ اس کا عمل سائنسی معیار تمیز کا مخالف ہے۔ سائنس حقایق کی بنیاد ٹھوس تجربات پر رکھتی ہے جن میں نئے تجرباتی حقایق کے پیش نظر تغیر و تبدل ممکن ہے لیکن اشتراکیت ہمیں تعصب سکھاتی ہے۔ ایک اشتراکی کے نزدیک لینن اور مارکس کی تحریریں کسی طرح صحیفۂ الٰہی سے کم نہیں ہیں اور وہ اُن کو اسی طرح بالائے تنقید مانتا ہے جس طرح الہامی مذاہب اپنی اپنی مخصوص کتابوں کو۔ حالانکہ یہ بات خود لینن اور مارکس کی تعلیمات کے خلاف ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ مارکس کے خیالات میں برابر تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اور اس نے ایک بہتر نظریہ کو سامنے رکھ کر غلط نظریوں کو ٹھکرا دیا ہے۔ مجھے خود بہت سے ایسے برگزیدہ اشتراکیوں سے سابقہ پڑ چکا ہے جو بحث میں شکست کھانے کے بعد بھی یہی فرماتے ہیں کہ جب تک مارکس کی شہرہ آفاق تصنیف "سرمایہ" کا مطالعہ نہ کیجئے گا، حقایق عالم آپ کی نظروں سے پوشیدہ رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحث کا کوئی جواب ممکن نہیں۔

مارکسیت پر فرائیڈ کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ باوجود تصوریت کی اصولی دشمن ہونے کے مارکسیت خود ہم کو ایک تخیلاتی گورکھندے میں مبتلا کرتی ہے اور ایک ایسے زمانہ پر اعتقاد رکھتی ہے جب ہر انسان تمام خطاؤں اور برائیوں سے جو سرمایہ داری کی پیداوار ہیں مبرا ہوگا، وہ دور انسانیت کی تکمیل کا دور ہوگا اور اس میں ہر انسان بلا دوسرے انسان کو تکلیف پہونچائے ہوئے زندگی بسر کر سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مارکسیت مذاہب پر کیوں اعتراض کرتی ہے جبکہ ان میں سے بعض اسی قسم کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں مثلاً عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت مسیح دوبارہ اس دُنیا میں آئیں گے اور

ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالیں گے جس میں امن اور چین کے سوا کچھ نہ ہوگا، اسی طرح حضرات شیعہ مہدی آخر الزماں کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اس وقت تمام عالم مسلمان ہو جائے گا۔

اس غلط فہمی میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں مارکس کا کوئی قصور نہیں، ساری خطا اس کے پیروؤں کی ہے جو اس غریب کی ہر بات کو آیت و حدیث قرار دیتے ہیں۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ مارکس کے زمانہ میں موجودہ نفسیات کا قطعی وجود نہ تھا اور اگر تھا بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ اس وقت نہ تو انسانی جبلت دریافت ہوئی تھی اور نہ جذبات انسانی کی ہمہ گیری کا اتنا شدید احساس تھا اس لئے مارکس کو اس زمانہ کے علوم سے جو مواد مل سکا، اسی پر اپنے نظریات کی بنیاد قایم کی جن میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔ تاریخ فلسفہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ فلسفہ فہم انسانی کے بار بار ٹھوکر کھانے اور غلطیاں کرنے کے مجموعہ کا دوسرا نام ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مارکس کا فلسفہ حیات بھی تاریخ فلسفہ سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں ہے پھر آخر کیا وجہ ہے کہ افلاطون، ارسطو، ڈیکارٹس، لیبنز، کانٹ، ہیگل اور نیٹشے کی فلاسفی پر تو تنقید روا رکھی جائے لیکن مارکس عقل کی کسوٹی کی گرفت سے باہر ہو۔

اگر ہم واقعی سنجیدگی سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جبلی نفسیات نے اشتراکیت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ یہ نفسیات ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کی فطرت باوجود مختلف نظریات کی پیروی کے نہ بدلی ہے اور نہ بدل سکے گی۔ مثال کے طور پر جارحانہ جبلت (Instinct of agression) کو لیجئے انسان اس وقت بھی لڑتا تھا جب وہ غاروں میں رہتا تھا اور آج بھی جنگ و جدال پر آمادہ ہے، صرف صورت بدل گئی ہے اور وہ یہ کہ آج انفرادی جنگ کے بجائے اجتماعی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ ہماری تہذیب زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ لڑنے کے طریقے بدل دے، کل ہم چھری، کٹار سے لڑتے تھے آج لکھوکھا افراد کی آبادی کو ایٹم بم کی نذر کر سکتے ہیں۔ مگر بات تو وہی رہی۔ پھر اشتراکیت کا یہ دعوائے معصومیت کیسا کہ انسان کسی زمانہ میں فرشتہ بن جائے گا اور یہ کہ فرشتہ خصالی صرف مزدور، مزدور کے بیٹے، مزدور کی بیوی اور مزدور کی بیٹی کی ملکیت ہے اور کوئی سرمایہ دار اسکی اس خاندانی وراثت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ بے شبہ زر کی غلط تقسیم ہزارہا معائب پیدا کرنے کا سبب ہے لیکن معائب کی پیدائش کی تنہا وجہ تقسیم زر نہیں قرار دی جا سکتی۔ فرائیڈ اشتراکیت کی خوبیوں کا بھی قایل ہے لیکن وہ اشتراکیت سے زیادہ اشتراکیوں سے خفا ہے کیوں کہ انھوں نے ایک نظریۂ حیات کو جو خالص علمی بنیاد پر تعمیر کیا گیا تھا، تعصب اور تنگ نظری کا پابند کر دیا۔ لیکن اسکے باوجود ہم یہ کہنے پر بھی مجبور ہیں کہ فرائیڈ جس انتہا پسندی کا الزام مارکسیت پر لگاتا ہے وہی خود اسکے پیش کردہ نظریۂ جنسیت پر بھی لگایا جا سکتا ہے اگر اقتصادیات کو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو جانیکا کوئی حق حاصل نہیں ہے تو جنسی نظریات کے تحت ہر انسانی فعل کا تجزیہ کرنا بھی درست نہیں ہو سکتا۔ صحیح اور سیدھا راستہ اعتدال کا ہے جو ان تمام حقایق کو خواہ وہ جنسی ہوں یا اقتصادی اپنے پیش نظر رکھتا ہوا زندگی کے مختلف مسائل کے حل کی فکر کرتا ہے۔ اور اس دکھی دنیا کو اسی قسم کے نظریہ حیات کی ضرورت ہے۔

خواجہ حسن نظامی الحمد اکیڈمی

اشارات

(غالب کے مطالعہ کے لئے)

جناب خیر بھوردی، غالب پر کام کرنے والوں کے لئے، ایک بڑی مفید چیز پیش کر رہے ہیں۔ انکی یہ کوشش گویا ایک قسم کی Bibliography ہے جس سے یہ پتہ چل سکے گا کہ غالب اس وقت تک کہاں کہاں کتنا کام ہو چکا ہے اور وہ کون سے ذرایع ہیں جن سے ابھی تک فایدہ نہیں اُٹھایا گیا۔

غالب پر اتنے مختلف زاویوں سے گفتگو ہو چکی ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اب ان میں کسی نئے اضافہ کی گنجایش ہے، لیکن جناب خیر بھوردی کی ذہانت نے آخرکار ایک پہلو گفتگو کا ایسا نکال ہی لیا جو نہ صرف نیا بلکہ مفید بھی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ وہ اسے کتابی صورت میں پیش کریں گے لیکن قبل اس کے کہ وہ اس ارادہ کو تکمیل کی حد تک پہونچائیں، انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وقتاً فوقتاً نگار میں یہ تمام معلومات شایع ہوتی رہیں۔ اس سے ایک فایدہ تو یہ ہے کہ اس طرح آہستہ آہستہ کتاب مکمل ہو جائے گی، دوسرے یہ کہ اس نوع کے معلومات اور جن جن حضرات کو حاصل ہیں، وہ بھی خیر صاحب کے پاس بھیجدیں گے اور وہ ان کے حوالہ سے کتاب میں درج کردیں گے۔

لنگڑے وکیل صاحب۔ بنارس دال منڈی میں جہاں ہر صغیر و کبیر اور میر و مرزا اپنے پیچھے ایک تاریخ رکھتا ہے ایک وکیل صاحب ہیں جو لنگڑے وکیل صاحب کے نام سے مشہور ہیں ان کی نانی کی پھوپھی مرزا نوشہ سے منسوب تھیں ان کے پاس مرزا کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی ہے۔

مولوی مہیش پرشاد۔ غالب سے متعلق اس وقت سب سے زیادہ سرمایہ مولوی مہیش پرشاد صاحب انچارج فارسی و اُردو ہندو یونیورسٹی بنارس کے پاس ہے جس کو انھوں نے اپنے ذاتی سرمایہ سے بیسیوں کوششوں کے بعد فراہم کیا ہے مرزا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کم از کم تیس تحریریں تو ایسی ہیں جو کہیں اور نہیں ہیں ان میں پندرہ خطوط ہیں اور پندرہ لفافے سب سے پُرانا لفافہ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۵۱ء کا اور سب سے پرانا خط ۱۸۵۱ء کا ہے۔ ایک خط ۱۸۵۰ء سے پہلے کا بھی ہے جس میں

مرزا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

ان تحریروں کے علاوہ مرزا کی اس تصویر کا عکس بھی ہے جو دہلی مرحوم کے قلعہ معلیٰ میں محفوظ ہے یہ تصویر ۱۹۲۹ء کے رسالہ اُردو میں اشتیاق علی صاحب سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ قلعہ معلّٰی کے شکریہ کے ساتھ شایع ہو چکی ہے یہ تصویر مرزا کے کسی ہم عصر مصور نے کھینچی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب تک جتنی تصویریں مرزا کی شایع ہوئی ہیں ان میں یہ تصویر سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے بالکل اسی تصویر کی نقل اکرام صاحب نے اپنے غالب نامہ میں شایع کی ہے۔ مرزا کی ایک تصویر نکات غالب میں مولانا نظامی نے شایع کی ہے ان کا بیان ہے کہ یہ تصویر ۱۸۶۷ء میں مرزا نے اپنے مرنے سے صرف دو سال پہلے کھچوائی تھی۔ "غالب نمبر" میں جو تصویر نواب صدر یار جنگ بہادر کے قیمتی کتب خانہ سے حاصل کر کے شایع کی گئی ہے وہ نادر خطوط غالب مرتبہ رسا ہمدانی میں کم فرق کے ساتھ موجود ہے تصویر کے اوپر بہت خوش خط حرفوں میں ذیل کا شعر لکھا ہوا ہے۔ اور دوسرے مصرع کے ختم پر کونہ میں اوپر کی طرف ۱۲۸۱ھ درج ہے۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

ان تمام تصویروں میں سب سے پرانی اور آخری تصویر وہ ہے جو رسالہ معیار لکھنؤ بابت ماہ جنوری ۱۹۱۰ء میں شایع ہوئی ہے۔ رسالہ کے مرتب سید عابد حسین خاں صاحب آبر کا بیان ہے کہ تصویر کو نواب سید بہادر حسین خاں صاحب انجم نیشاپوری سے ملی تھی اور اُن کو خواجہ قمر الدین خاں صاحب راقم نے جے پور سے بھجوائی تھی جو مرزا کے عزیز قریب ہوتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا کے آخر وقت میں اُن کے چند شاگردوں نے یہ تصویر اس طرح کھنچوائی تھی کہ اُن کو بڑی مشکل سے اُٹھا کر بٹھا دیا تھا، مرزا کی تصویروں کے بارے میں بھی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ قابل اعتماد اور صحیح تصویر کون سی ہے۔ تصویروں کو "سلسلۂ غالبیات" سے الگ نہیں کیا سکتا۔

غالب سے متعلق اُن بے شمار مضامین کے علاوہ جو مختلف اخبارات و رسایل میں شایع ہوئے ہیں اسوقت تک حسب ذیل کتابیں میری نگاہوں سے گزر چکی ہیں، مضامین کا جایزہ کسی دوسری نشست میں پیش کروں گا۔

دیوان غالب ۔ دیوان مطبع احمدی دہلی میں بیسویں محرم الحرام ۱۲۷۵ھ کو امو جان کے اہتمام میں تیسری بار طبع ہوا ہے۔ جس کے آخر میں خاتمۂ دیوان کے عنوان سے مرزا نے لکھا ہے کہ:۔

"داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے مخلص وفادار آئیں میر قمر الدین کی کار فرمائی اور خاں صاحب الطاف نشاں محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں مطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں۔ لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔

یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو۔ مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے کہاں تک بدلتا۔ ناچار جا بجا یوں ہی چھوڑ دیا۔ یعنی "کسو" بہ کاف مکسورہ و سین مضموم و واؤ معروف، میں نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں، قافیہ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ افصح "کسی" ہے۔ واؤ کی جگہ یائے تحتانی میرے دیوان میں ایک جگہ "کسو" بہ واؤ ہے اور سب کچھ "کسی" یائے تحتانی ہے۔ اس کا اظہار ضروری تھا، کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔ مطبع احمدی میں واقع دہلی اموجان کے اہتمام سے بیسویں محرم الحرام ۱۲۷۸ھ کو مطبوع ہوا۔"

یہ عبارت حاشیے پر ختم ہوئی ہے۔ اس کے بعد ہی جلی حرفوں میں اشتہار لکھا ہوا ہے اور اس کی تحت یہ عبارت ہے:۔

"حسب منشا قانون یازدہم ۱۸۳۵ء بہ غیر اجازت احقر البرید کسے شخص انطباع دیوان ہذا نہ فرماید۔"

جہاں یہ عبارت ختم ہوئی ہے "فقط" سے ذرا ہٹ کر مہر ہے جس میں یہ عبارت درج ہے:۔

"نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب۔"

ایک طرف "العبد" کے نیچے "سید قمر الدین لکھا ہوا ہے۔ تاریخ انطباع دیوان کے عنوان سے نواب محمد ضیاء الدین خاں رئیس لوہارو جو فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے اور مرزا یوسف علی خاں المخاطب بہ سلطان الذاکرین والمتخلص بہ عزیز کے قطعات ہیں۔ صفحہ اٹھاسی کے بعد ایک ورق غلط نامے کا بھی ہے جس میں "تمام شد" کے نیچے المذنب محمد مقصود" چھپا ہوا ہے۔

اس دیوان کے علاوہ دیوان کے دو قدیم مطبوعہ نسخے اور بھی دیکھ چکا ہوں ایک مطبع نظامی کان پور کا چھپا ہوا ہے۔ جو شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں چھاپا گیا ہے، جس کے متعلق مالک مطبع عبد الرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں نے لکھا ہے کہ "محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے ایک نسخہ بعد تصحیح جناب مصنف نے میرے پاس بھیجا۔ میں نے اس نسخے کے مطابق شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں بہ صحت تام و درستی کمال چھاپا۔"

یہ نسخہ مولانا محمد سلیمان صاحب متوطن گھوسی ضلع اعظم گڑھ صدر مدرس مدرسہ عربیہ سیر بلیتھر اروڈ۔ ضلع بلیا کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ دوسرا نسخہ ۱۸۸۲ء کا چھپا ہوا ہے جو انجمن ترقی اردو کی لائبریری میں موجود ہے۔

اردوئے معلیٰ ۔ مطبوعہ مطبع فاروقی۔ دہلی بازار بلی ماران ۱۲۸۵ھ۔ اس کا دیباچہ میر مہدی مجروح نے لکھا ہے اور خاتمۂ کتاب کی عبارت مرزا قربان علی بیگ خاں سالک نے تحریر فرمائی ہے۔ یہ کتاب مرزا کی وفات کے بعد شایع ہوئی ہے۔ تاریخ سال طبع اور تاریخ سال وفات مرزا قربان علی بیگ سالک نے چار شعروں کے ایک قطعہ میں اور تاریخ طبع دو شعروں کے قطعہ میں جواہر سنگھ جوہر نے لکھی ہے۔ جوہر کے قطعہ تاریخ کے نیچے ایک طرف بہ خط نسخ "اعلان" ہے اور اسکے سامنے اُسی خط میں "کاپی رائٹ محفوظ" لکھا ہوا ہے۔ اعلان کے نیچے بہ خط نسخ "العبد" لکھا ہوا ہے اور اسکے سامنے

"سید عبدالسلام ابن سید محمد معظم پروپرائٹر مطبع فاروقی دہلی" درج ہے صفحہ ۳۸۶ پر جہاں کئی کتابوں کا اشتہار ہے بیچ میں حوض کے اندر اعلان کے نیچے یہ عبارت ہے۔

"رقعات مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی الموسوم بہ اُردوئے معلّٰی حسب اجازت افسر الاطبا، اشرف الحکما مسیح وقت فلاطون دہر حکیم غلام رضا خاں صاحب رئیس دہلی مطبع فاروقی دہلی میں چھپی بدوں اجازت صاحب موصوف الصدر کوئی صاحب اب قصد طبع کا نہ کریں۔ ہاں جس قدر جلدیں مطلوب ہوں راقم سے طلب فرمائیں۔

راقم سید عبدالسلام ابن مولوی سید محمد معظم صاحب مالک مطبع فاروقی دہلی بازار بلی ماراں"

مہر صاحب مصنف غالب کا بیان ہے کہ اُردوئے معلّٰی کا پہلا اڈیشن مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھپا تھا۔

عود ہندی — مطبوعہ مطبع نارائنی - دہلی بازار سیتا رام ۱۸۷۸ء شروع میں ممتاز علی خاں نے وجہ ترتیب بیان کی ہے۔ اس کے بعد چودھری عبدالغفور کا لکھا ہوا دیباچہ ہے اور آخر میں حکیم غلام مولا تلق میرٹھی کی تقریظ ہے۔

وثوق صراحت — اُردو دیوان غالب کی شرح ہے جس کا تاریخی نام "وثوق صراحت" ہے، مولوی عبدالعلی والہ دکنی کی لکھی ہوئی ہے، ان کی زبان میں "یہ شرح بہ طرز تازہ و پاکیزہ مفید منتہیان" ہے۔ مطبع نامی فخر نظامی حیدر آباد دکن میں پہلی ۱۸۹۶ء میں چھپی ہے۔

حل کلیات غالب — مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی کی تصنیف ہے جو اپنے آپ کو السنۂ مشرقیہ لکھا کرتے تھے انھیں کے مطبع شوکت المطابع سے ۱۳۱۷ھ میں شایع ہوئی ہے۔ زور قلم کا اچھا نمونہ ہے۔

شرح دیوان اُردوئے غالب — مولوی علی حیدر طباطبائی لکھنوی کی تصنیف ہے ۱۳۱۹ھ میں مطبع مفید الاسلام کوٹلہ اکبر جاہ حیدر آباد میں چھاپی گئی ہے۔ کئی لحاظ سے مفصل شرح ہے، مگر کئی اعتبار سے قابل غور بھی ہے، ایک تو انداز بیان جس کی وجہ سے شارح کا مفہوم سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، دوسرے غیر متعلق مباحث جن کا نہ تو شعر کی شرح سے کوئی تعلق ہے نہ غالب کی ذات۔

وجدانِ تحقیق — محمد عبدالواحد صاحب واحد کی لکھی ہوئی شرح دیوان غالب ہے۔ واحد صاحب والہ مرحوم مصنف وثوق صراحت کے فرزند ارجمند ہیں ان کا بیان ہے کہ وجدان تحقیق وثوق صراحت کے اشارات کی صراحت اور وضاحت ہے۔ مطبع فیض منبع فخر نظامی حیدر آباد سے ۱۳۱۹ھ میں شایع ہوئی ہے۔

نکات غالب — نظامی بدایونی مرحوم نے مرتب کیا ہے اور اپنے مشہور نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۲۰ء میں شایع کیا ہے اس میں مرزا کی خود نوشتہ سوانح عمری اور وہ نکتے ہیں جو مرزا نے وقتاً فوقتاً اپنے خطوط میں بیان کئے ہیں۔ ان کے لطیفے بھی شامل ہیں۔

مرزا غالب کی شاعری — مرزا محمد عسکری بی۔ اے کا ایک لکچر ہے جو مسلم اکاڈمی کی محفل منعقدہ احمدی ۱۳۴۱ھ

میں سنایا گیا تھا ۱۹۲۵ء میں دلگداز پریس لکھنؤ سے شایع ہوا ہے۔

مرقع ادب ۔ صفدر مرزا پوری کی تالیف ہے جو ۱۹۱۷ء میں مجتبائی پریس لکھنؤ میں چھپی ہے اس میں مرزا کے پانچ خط شایع کئے گئے ہیں۔

ادبی خطوط غالب ۔ مرزا محمد عسکری کا قابلِ قدر ادبی کارنامہ ہے۔ جس میں ایسے خطوط ہیں جن میں مرزا نے بہت سے ادبی نکات حل کئے ہیں اور اپنے اشعار کے معنی سمجھائے ہیں ۱۹۲۹ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے شایع ہوا ہے۔

مرزا غالب ۔ عشرت رحمانی کی کوشش ہے اس میں مرزا کے حالات کمالات ان کے فلسفیانہ و صوفیانہ کلام پر مختصر تبصرہ کے ساتھ ساتھ کلام کا انتخاب بھی کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں تعلق پرنٹنگ ورکس کٹڑا دینا بیگ دہلی سے شایع ہوئی ہے۔

مرزا غالب کی شوخیاں ۔ رسالہ "نگار" لکھنؤ کا خاص نمبر ہے جو جنوری ۱۹۳۲ء میں شایع ہوا ہے، اس نمبر میں مرزا کی بزلہ سنجی اور شوخ نگاری میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

دیوانِ غالب (گجراتی اڈیشن) ۔ مرزا کا یہ دیوان گجراتی رسم خط میں اورینٹل پرنٹنگ ورکس احمد آباد سے ۱۹۳۳ء میں شایع ہوا ہے اس پر مفصل تبصرہ لکھ رہا ہوں۔

رسالہ ہندستانی ۔ الہ آباد بابت ماہ جنوری ۱۹۳۴ء مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد اس رسالہ میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جس کا مطالعۂ غالب محتاج تعارف نہیں ہے مرزا کے خطوط کے کئی پلان شایع کئے ہیں۔ اور اس کی بھی تحقیق کی ہے کہ یہ خطوط مرزا نے کس کے نام لکھے ہیں۔

خطبۂ صدارت ۔ یہ خطبۂ صدارت قاضی عبدالغفار صاحب نے ۱۹۴۴ء میں بمبئی کے شاندار جلسہ یوم غالب کے موقعہ پر پڑھا تھا۔ قاضی صاحب نے غالب کی شاعری کو درد انگیز انقلابی شاعری ثابت کرنے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو سے کام لیا ہے بادہ و ساغر کا سہارا نہیں لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ غالب نہ صرف ایک راسخ العقیدہ وطن پرست تھا بلکہ باوجود اس قصیدہ نگاری کے جس میں اس نے ارباب ثروت کی ثنا و صفت کے دریا بہا کر اپنی انسانی کمزوریوں کا یہ پہلو نمایاں کیا ہے اس کا وجود معنوی بلاشبہ زمانہ کے ایک ستم رسیدہ باغی کا انقلاب پسند وجود معنوی تھا۔ یعنی تیموری دربار کی آخری شمع کے گل ہونے کے بعد وہ اپنے آقاؤں کی شان میں جو قصیدے لکھتا تھا وہ بھی اس کی باغی روح کے چہرے کا محض ایک انقلاب تھے اور فی الاصل اسکے دیوان کا ہر ورق اسکے دل کی باہتوں کے خون سے لالہ کار ہے۔

صحیفۂ غالب ۔ اس کے مرتب و مولف شیخ عبدالرحمٰن طارق ہیں اس صحیفہ میں مرزا غالب کے شاعرانہ محاسن گنوائے گئے ہیں اور جابجا مشکل اشعار کی شرح بھی کی گئی ہے، ۱۹۳۵ء میں پہلی بار گیلانی الکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپا ہے۔

(باقی)

خیر بہوروی

انیس کی مرثیہ نگاری

اور

"فاروقی صاحب کی ستم ظریفی"

کچھ عرصہ سے رسالہ نگار لکھنؤ میں جناب محمد احسن فاروقی ایم، اے، پی ایچ، ڈی، استاد انگریزی لکھنؤ یونیورسٹی کا ایک مسلسل مضمون "مرثیہ نگاری اور میر انیس" باقساط شایع ہو رہا تھا جو دسمبر ۵۷ء میں ختم ہوا ہے۔ تمہید میں جناب موصوف نے فرمایا ہے کہ :-

"کسی صنف ادب کا مطالعہ علمی اصول پر اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم اُس کی ضرورت، ہیئت، نوعیت اور زندگی سے اُس کے تعلق کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں"

پھر وعدہ فرمایا ہے کہ مراثی انیس کا مطالعہ اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر ہوگا۔ اور بسم اللہ یوں کی ہے کہ اُردو ادب کی سب زیادہ طبعزاد[1] اور غیر تقلیدی صنف مرثیہ ہے۔ (ص ۲) — اُن کا یہ ادعا درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ضمیر سے پیشتر اُردو میں جس طرح کا مرثیہ رائج تھا وہ فارسی کی ہو بہو نقل تھی اور اس میں صرف شہدائے کربلا کے مصائب کا تذکرہ ہوتا تھا یہ مراثی بالعموم شاعرانہ خوبیوں اور جوش و خروش سے خالی ہوتے تھے۔ اول اول سودا نے مرثیہ میں کہیں کہیں شعریت پیدا کی۔ اُس کے یہ چار مصرعے آج بھی تاثیر سے لبریز ہیں :-

یارو سنو تو خالقِ اکبر کے واسطے — انصاف سے جواب دو حیدر کے واسطے
وہ بوسہ گہ نبی تھی پیمبر کے واسطے — یا ظالموں کی برّشِ خنجر کے واسطے ؟

قدیم مرثیہ گویوں میں ایک میاں سکندر تھے، اُن کا ایک مرثیہ :-

"ہے روایت شتر سوار کسی کا تھا رسول"

---

[1] غالباً فاروقی صاحب کا مقصود تحریر یہ تھا کہ صنف مرثیہ اپنی اس نوعیت و خصوصیت کے لحاظ سے جو اُردو کے مرثیہ نگاروں اور انیس کے یہاں پائی جاتی ہے، غیر تقلیدی چیز ہے۔ کسی چیز کے طبعزاد یا غیر تقلیدی ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس کا مواد پہلے سے موجود نہ ہو بلکہ محض ہیئت کی تبدیلی بھی اسے original بنا سکتی ہے اور فاروقی صاحب نے اسی مفہوم میں اسے طبعزاد یا غیر تقلیدی کہا ہے۔ (نیاز)

پیکرِ سوز و گداز ہے اور کچھ برس اُدھر تک اتنا مقبول تھا کہ فقیر اُسے پڑھتے ہوئے پھیری لگاتے تھے۔ جہاں تک تحقیق ہو سکا ہے سودا ہی پہلا شاعر تھا جس نے صنف مسدس میں مرثیہ کہا اور اب یہ امر قریب قریب مسلّم ہے کہ مرثیہ کہنے کے لئے اس سے زیادہ مناسب اور جولانیِ طبع دکھانے کے لئے وسیع ترین امکانات مہیا کرنے والی کوئی دوسری صنف سخن نہیں۔ البتہ فاروقی صاحب کا یہ ارشاد بجا ہے کہ مرثیہ میں جوش و خروش اور شان و شکوہ کا اضافہ ضمیر (اور خلیق) کے وقت سے ہوا۔

اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ "مرثیہ ایسی صنف ادب ہے جو عربی[1] و فارسی کیا یورپ و ایشیا کے کسی ادب میں نہیں ملتی۔ عام طور پر نقاد مرثیہ کے لغوی معنی لے کر اُن نظموں کو مرثیہ کہہ دیتے ہیں جو دنیا کے شاعروں نے اپنے دوست، عزیز یا کسی بڑے آدمی کے بچھڑ جانے پر لکھی ہیں"۔ اُن کا ادعا ہے کہ "اس "غلطی" کی ابتدا مولانا شبلی نے کی اور اُس کے بعد عام ہوگئی حالانکہ ان نظموں کا ہمارے مرثیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظمیں ذاتی جذبات کا اظہار کرتی ہیں اس لئے ان کا تعلق غنائی (lyric) یا داخلی شاعری سے ہے اور مرثیہ چونکہ پوری قوم کے مذہبی جذبات کا آئینہ دار ہے اس لئے اس کی نوعیت بالکل جدا ہے اور وہ خارجی شاعری سے تعلق رکھتی ہے۔" (ص ۳)

حیرت ہوتی ہے کہ مولانا شبلی مرحوم انگریزی کے عالم نہ ہونے کے باوجود کس قدر باخبر اور ادب کے کیسے زبردست نبّاض تھے اور فاروقی صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے استادِ انگریزی مغربی ادبیات سے عدم واقفیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مولانا شبلی جو برسوں اُدھر فرما گئے وہ آج بھی یورپ میں سکّہ رائج الوقت ہے۔ یوروپین ناقدین نے جہاں شاعری کو داخلی اور خارجی اقسام میں تقسیم کیا ہے یہ شرط بھی لگا دی ہے کہ یہ تقسیم محض برائے امتیاز ہے ورنہ عام طور پر اور بالخصوص جدید شاعری میں شخصی یا داخلی اور غیر شخصی یا خارجی شاعر کے عناصر گھل مل جاتے ہیں۔ بعض لوگ نادانی یا سہل انگاری سے داخلی شاعری کو لریکل (غنائی) کہتے ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ لریکل یا غنائی شاعری کا دائرہ داخلی شاعری تک محدود نہیں بلکہ وسیع تر ہے۔

اب آئیے دیکھیں کہ یوروپین ناقدین کے بموجب لریکل شاعری کے خصوصیات کیا ہیں:۔

"اولاً یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو تحریرِ نظم کا محرک ہوا اور کس نہج سے اُس کا اظہار ہوا۔ مزید براں وہ

---

[1] مرثیہ عربی میں وہی ہے جس کو انگریزی میں Elegy یا Dirge کہتے ہیں لیکن ہیئت و طرز کے لحاظ سے عربی مرثیہ اکثر و بیشتر یونانی و لاطینی مرثیوں سے مختلف ہوتا تھا۔ اگر کوئی مرثیہ اس انداز کا ہے تو وہ برۂ کنانیہ کا لکھا ہوا ہے جو کتاب الاغتیارین میں محفوظ ہے۔ قدیم عربی میں رسم تھی کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو خاندان کا کوئی فرد جو شاعر ہوتا تھا مرجانے والے کی خوبیاں نظم کر کے پڑھتا تھا۔ اس میں قصیدہ کی سی تشبیب نہ ہوتی تھی بلکہ صرف سجع یا ترصیع ہوتی تھی ـــــ مرثیہ کی وہ صورت جو انیس کے مراثی میں پائی جاتی ہے یا امام حسینؑ اور شہداء کربلا کا ذکر جس انداز سے انیس نے کیا ہے وہ عربی میں نہیں پایا جاتا۔ (نیاز)

جذبہ وقیع (worthy) ہونا چاہئے، ایسا جذبہ جو اپنی علویت اور صداقت سے ہمیں متاثر کرے، اس کی زبان اور طرز ادا میں نہ صرف حسن اور چمک دمک ہو بلکہ جذبہ و طریق اظہار جذبہ میں توازن و تناسب ہو۔ یہ بھی ضرور ہے کہ لیرکل شاعری کا جوہر تو داخلی یا شخصی ہوتا ہے لیکن اسی لیرکل شاعری کو ادبیات میں جگہ ملتی ہے جس میں انفرادیت اور مخصوصیت کے باوصف عام انسانی اقدار کی مصوری ہے، جزو سے کل کی طرف اشارہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ جزو کل کا نشان راہ بن جاتا ہے اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ گویا اس کے ذاتی تجربات بیان کئے جا رہے ہیں۔ علاوہ برایں کثیر مقدار لیرکل شاعری کی ایسی ہے جس کی نوعیت ذاتی یا داخلی نہیں ہوتی بلکہ پوری قوم یا فرقہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ مثلاً میں "نغمات داؤد" (Psalms of David) کو لے لیجئے ان میں جہاں جہاں لفظ "میں" (I) آیا ہے اس سے پورا فرقۂ بنی اسرائیل مراد ہے"۔[1]

فاروقی صاحب کی خط کشیدہ عبارت کا متذکرۂ بالا خط کشیدہ عبارت سے مقابلہ کیجئے اور انھیں انگریزی انتقاد کے حق میں فیصلہ پر داد دیجئے۔

یہیں ایک دوسرے امر کی طرف اشارہ کر دوں۔ فاروقی صاحب نے بار بار فرمایا ہے کہ انیس فلسفی شاعر نہیں تھے اس سے قطع نظر کہ وہ ایسے تھے یا نہ تھے یہ امر مسلم ہے کہ فلسفیانہ و معلمانہ شاعری کا امکان داخلی شاعری میں ہے نہ کہ خارجی یا بیانیہ شاعری میں۔ فاروقی صاحب خود فرماتے ہیں کہ مراثی انیس کا تعلق خارجی یا بیانیہ شاعری سے ہے پھر اس میں فلسفہ کی تلاش کیسی؟[2] تفصیلی بحث کسی دوسری جگہ ملے گی۔

میں نے اپنے اقوال میں سند کا حوالہ اس وقت کے لئے اٹھا رکھا ہے جب فاروقی صاحب اپنے فرمودات کی تائید میں مغربی نقادوں کے اسماء پیش کریں گے اور کتابوں کا مع صفحہ یا صفحات حوالہ دیں گے۔

---

[1] یہ اقتباس غالباً ہڈسن کی کتاب سے کتاب سے کیا گیا ہے، لیکن Entwistle نے جو اس کے موضوع پر استنادی حیثیت رکھتا ہے اپنی مشہور کتاب "Study of Poetry" میں، غنائی (Lyric) شاعری کی آٹھ خصوصیات بتائی ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ وہ داخلی (Subjective) ہوتی ہے۔

داخلی شاعری میں شاعر اُن تاثرات و حالات کو ظاہر کرتا ہے جن سے وہ خود گزرا ہے۔ خارجی شاعری میں جس کو "جگ بیتی" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، دوسروں کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے میر انیس کے مراثی یقیناً خارجی شاعری سے متعلق سمجھے جائیں گے۔ (نیاز)

[2] میں نہیں سمجھتا کہ فلسفیانہ شاعری کو خارجی یا بیانیہ شاعری سے کیوں علیحدہ کیا جاتا ہے فلسفیانہ شاعری خارجی و داخلی دونوں رنگ سے تعلق رکھ سکتی ہے۔ (نیاز)

فی الحال اُن کی ایک دوسری خوش فہمی کی بدیہی مثال حاضر ہے۔ اُنھوں نے یہ قول ارسطو سے منسوب کیا ہے:-

"ڈرامہ اور ایپک خوف کے جذبات کو دور کرتے ہیں"۔ (ص ۱۰)

اول تو جہاں تک میرا مطالعہ ہے، ارسطو نے اس سلسلہ میں لفظ ڈرامہ استعمال ہی نہیں کیا، دوم اُس کا مطلب غلط بیان کیا گیا۔ سوم اُس کا قول جو مبہم اور ناتمام نقل کیا گیا، ایپک سے نہیں بلکہ ٹریجڈی سے متعلق ہے۔ اگر ڈرامہ سے فاروقی صاحب کا مدعا ٹریجڈی تھا تو اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ اظہار مطلب میں احتیاط نہیں برتی۔ ڈرامہ کا اطلاق کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ کامیڈی کو رحم یا خوف کے جذبات سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ ارسطو کی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹریجڈی رحم اور دہشت کے جذبات کو اُبھار کر اُن جذبات (یعنی جذبات رحم و دہشت) کی اصلاح و تہذیب[1] کرتی ہے۔ انگریزی عبارت یہ ہے:-

Tragedy — effecting through pity & horror the Correction & refinement of such passions:

کہاں یہ عبارت کہاں یہ مہمل فقرہ کہ "ڈرامہ اور ایپک خوف کے جذبات کو دور کرتے ہیں!"

فاروقی صاحب کے نقل کردہ اقوال کی تردید کے بعد اُن کے دیگر مزعومات ناقابل اعتنا ٹھہرتے ہیں اور اُنھوں نے مرثیہ پر جتنے اعتراضات بلحاظ صنف و موضوع وارد کئے ہیں مسترد ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ نظرئے ہی غلط سمجھے گئے یا غلط استعمال کئے گئے جن کی بنا پر مرثیہ سے اعتراض کیا گیا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مرثیہ اپنی ابتدائی شکل میں سیدھی سادی ایلیجی (Elegy) تھا لیکن انیس اور دبیر نے اُسکو مرتفع کر کے ٹریجڈی اور ایپک شاعری کا (وسیع ترین یونانی مفہوم میں) رتبہ دے دیا۔

فاروقی صاحب مرثیہ کو مرثیہ ہی نہیں سمجھتے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اُس کی صنف کو غیر متعین رکھنے کے بعد اُسے ادب کی قلمرو سے بھی یک لخت خارج کر دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُنھیں "فلاطون وقت" کہنا بیجا نہ ہوگا، اُس نے بھی اپنی "جمہوریہ" میں شاعروں کے لئے گنجایش نہ پائی۔ فرماتے ہیں کہ:-

"مرثیہ بنیادی[2] طور پر ادبی چیز ہے بھی نہیں۔ اول اول اس میں ادبی عناصر اضافہ کرنے کا خیال میر ضمیر کو پیدا ہوا،

---

[1] فاضل مقالہ نگار نے اصلاح و تہذیب کا ترجمہ غالباً لفظ Katharsis کا کیا ہے جو ارسطو نے استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کا صحیح مفہوم انگریزی لفظ Purgation سے ظاہر ہوتا ہے جسے نوچیرا اور بائی واٹر نے لکھا ہے جو ارسطو کے پوتیقا کے نہایت مستند ترجمہ سمجھے جاتے ہیں اور Purgation کا ترجمہ اصلاح و تہذیب" درست نہیں ہے بلکہ صحیح ترجمہ ہی ہے جو فاروقی صاحب نے کیا ہے۔

[2] بنیادی سے مقصود یہ ہے کہ اول اول مرثیہ میں کوئی ادبیت نہیں پائی جاتی تھی۔ (نیاز)

لیکن اُن کے ادراک کا رجحان زیادہ تر مبالغہ کی طرف ہے اس لئے مرثیے میں بھی یہی رنگ غالب رہا اور میر ضمیر نے تمام اصناف سخن کو مرثیہ میں کھپا کر مرثیہ کو ایک نئی صنف بنا دی"۔ (ص ۱۱)

کاش فاروقی صاحب اپنے حافظہ پر زور دے کر اپنا پہلا قول یاد کر لیتے کہ اُردو ادب کی سب سے زیادہ طبعزاد اور غیر تقلیدی صنف مرثیہ ہے۔ لفظ "بنیادی" میں فاروقی صاحب نے جو کچھ معنویت بند کی ہو بظاہر دونوں اقوال میں تضاد ہے۔ جب وہ میر انیس کے مرثیہ کو مرثیہ ہی نہیں سمجھتے تو ہمیں یہ سوال اُٹھانے کا حق ہے کہ پھر میر انیس کے مفروضہ یا نام نہاد مرثیہ کو کس صنف سخن میں جگہ دیتے ہیں۔ میں نے تو آج تک ایسی کوئی نظم نہیں دیکھی جس کی صنف کا تعین[1] نہ ہو سکے یہ کہدینا کافی نہیں کہ انیس کے مرثیہ میں دیگر اصناف شاعری مثنوی، قصیدہ وغیرہ کے عناصر سموئے ہوئے ہیں، اس مرکب کی نمایاں خصوصیت کیا ہے، کس جذبہ کے ماتحت لکھا گیا۔ جہاں یہ فیصلہ ہوا صنف کا عقدہ حل ہوا۔ میں آگے چل کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ مرثیہ کی ارتقائی صورت جو انیس اور دبیر کے کلام میں پائی جاتی ہے ایپک شاعری کے اکثر و بیشتر لوازم پورے کرتی ہے۔ اُن کا یہ فرمانا کوئی وقعت نہیں رکھتا کہ میر انیس ایپک لکھتے کیا جب وہ ایپک کے مفہوم سے ہی ناواقف تھے۔ کیا فردوسی[2] کو اس مفہوم پر عبور تھا، کیا کالیداس[3] نے ارسطو کی "Poetics" پڑھی تھی، کیا ہومر[4] نے جس کی شاعری پر ایپک کی بنیاد قایم ہوئی پہلے ایسی شاعری کے اصول وضع کئے اور اپنا مطلب واضح کرنے کو ایلیڈ تصنیف کی؟ اگر جواب نفی میں ہے تو فاروقی صاحب کا ہوائی قلعہ خود بخود ڈھا جاتا ہے۔

فاروقی صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ مجلس عزا فرقۂ شیعہ کی ایک اہم مذہبی رسم ہے اور مرثیہ کو مجلس سے الگ کر کے مرثیہ کی کوئی ضرورت[5] یا اہمیت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اُن کا یہ ادعا بھی غلط ہے کہ اس نوع کی شاعری کا تعلق مذہب کے اُس عام پہلو سے ہوا کرتا ہے جو عوام کے لئے اہمیت رکھتا ہے اور مرثیہ عوامی شیعیت کا آئینہ دار ہے۔

---

[1] فاروقی صاحب نے اس کی وضاحت کردی ہے کہ مرثیہ کا مقصود صرف جذبات ترحم پیدا کرنا ہے اس لئے وہ خطابت یا Rhetorica میں آتا ہے اور ان تمام اصناف شاعری سے جدا ہے جن کا ذکر ارسطو نے پوئیٹکا میں کیا ہے۔ (نیاز)

[2] شاہنامہ خالص ایپک شاعری نہیں ہے لیکن اس خیال سے کہ اس میں ایک قوم کی تاریخ کا ذکر ہے اسے ایپک کے مماثل کہہ سکتے ہیں۔ (نیاز)

[3] کالیداس نے ایپک کوئی نہیں لکھی۔ اس کا مشہور ڈرامہ شکنتلا بھی کمیڈی ہے ٹریجڈی نہیں۔ (نیاز)

[4] ہومر ہی کو تو سامنے رکھ کر ایپک کے اصول متعین کئے گئے، علاوہ اس کے یہ ضروری نہیں کہ کوئی شاعر ایپک کے اصول جاننے کے بعد ہی ایپک لکھ سکے۔ لیکن اگر کسی نظم کی بابت ایپک ہونے کا دعویٰ کیا جائے گا تو اس پر یقیناً اصول ایپک کے لحاظ سے غور کرنا چاہئے۔ (نیاز)

[5] ضرورت و اہمیت میں فرق ہے۔ اہمیت تو یقیناً تھی کیونکہ وہ ایک ادبی شاہکار تھا، لیکن اس سے ہٹ کر ضرورت کا کوئی سوال مرثیہ کی بابت پیدا نہیں ہوتا۔ (نیاز)

اُنھیں غالباً علم نہیں کہ ان مجالس میں شریک ہونے والوں کا بیشتر حصہ ایسے اشخاص پر مشتمل ہوتا تھا جو پڑھے لکھے صاحبِ ذوق، کلام کی خوبیوں کو سمجھنے اور صحیح داد دینے کے اہل ہوتے تھے۔ یہ مجلسیں ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے بپا رہتی تھیں اور لوگ بہت قبل سے جمع ہونے لگتے تھے، عوام کو اتنا صبر کہاں کہ گھنٹوں بیٹھے ہوئے ایسا کلام سنتے رہیں جو اُن کے فہم سے باہر ہے۔ مرثیہ کو عوام کے لئے اہمیت رکھنے والا اور عوامی شیعیت کا آئینہ دار کہنا حقیقت کا منھ چڑانا ہے۔ اُن کا یہ قول بھی خلاف واقعہ ہے کہ مرثیہ مجلس ہی کے لئے لکھا جاتا تھا اور مجلس سے باہر یا مجلس سے الگ مرثیہ کی ضرورت یا اہمیت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اُنھوں نے شاید سنا ہو کہ اہل ذوق دو جتھوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور "انیسئے" یا "دبیرئے" کہلاتے تھے۔ ان میں برابر نوک جھونک رہتی تھی اور معرکے گرم ہوا کرتے تھے۔ ان میں کا ہر فرد اپنے محبوب شاعر کی مدح اور اُس کے حریف کی منقصت کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہنگامہ آرائی مجلس عزا میں تو ہوتی نہ بلکہ علیحدہ اکھاڑا جمتا تھا۔ بعض موقعوں پر یہ لوگ عین مجلس میں بھی چھینٹے آجاتے تھے۔ میر انیس نے ایک مصرع پڑھا:۔

"جس طرح کہ نغمے کی صدا ساز پہ دوڑے"

"دبیر یا" چلّا یا کہ اے حضور کیا خوب فرمایا ہے "پدوڑے" پھر زحمت فرمائیے!

مرزا دبیر ایک مجلس میں پڑھے:۔ "گنج نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں"

"انیسیا" آئی پر کپ چوکنے والا تھا۔ اے حضور سبحان اللہ گنجے نبی!" ہوہ ہوہ!۔ مرزا صاحب کو احساس ہوا اور فوراً مصرع یوں بدل کر پڑھا:۔ "کان نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں"۔ انیسئے نے پھر گوشہ نکالا، "کانے نبی!" چشم بد دور! چشم بد دور! میری آنکھوں میں ہَف!۔ مرزا صاحب نے سہ بارہ مصرع یوں پڑھا: "بحر نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں" "انیسئے" نے پھر گرفت کی "بہرے نبی" صل علیٰ، صل علیٰ۔ فصاحت کا دریا موجِ زن ہے اور سامعہ کوثر و سلسبیل میں غوطے کھا رہا ہے!

حقیقت جو کچھ ہو مگر یہ واقعات عام طور پر مشہور اور زبان زد تھے۔ جب یہ لوگ اُٹھ گئے تو مناقشہ تقریر سے زیادہ تحریر میں ایک عرصہ تک جاری رہا۔

انیس کے کلام کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ مرثیہ پڑھا نہیں اور پورے پورے بند لوگوں کو یاد ہو گئے اور احباب کو جو مجلس میں شریک نہ تھے سُنائے جانے لگے اور موافقت یا مخالفت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب کے مداحوں میں بعض کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ پورا مرثیہ دوران خواندگی میں ازبر ہو جاتا تھا، گھر پہونچ ضبط تحریر میں لائے اور دیگر شائقین نے نقلیں حاصل کرنے کا تانتا باندھ دیا۔ میر صاحب مرثیہ عام ہو جانے سے جز بز ہوتے تھے۔

اُن کی خوشنودیِ مزاج کے لئے ایسے لوگوں کو مجلس میں آنے کی ممانعت کر دی گئی اور سختی سے نگرانی رکھی گئی۔ میر صاحب نے اس احتیاط کے بعد بھی جو مرثیہ پڑھا بدستور زبان زد ہو گیا۔ ٹوہ لگانے پر معلوم ہوا کہ ایک صاحب بہت

سویرے سے آکر منبر کے غلاف کے اندر چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور باطمینان فراغت مرثیہ لکھتے یا حفظ کرتے رہے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرہ گلشنِ بے خار میں لکھا ہے کہ اُن کے احباب لکھنؤ سے ناسخ کی تازہ غزلیں تحفۃً بھیجتے تھے۔ کیا یہ قرینِ قیاس نہیں کہ اسی طرح انیس اور دبیر کے مراثی کی نقلیں بھی جاتی ہوں اور لکھنؤ سے باہر بھی خراجِ تحسین وصول کرتی ہوں[1]؟

میں عنفوانِ شباب میں نواب احمد سعید خاں طالب مرحوم رئیس لوہارو ساکن دہلی کی معیت میں درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین علیہ الرحمہ میں باریاب ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ درگاہ شریف کے احاطہ میں ایک صاحب جو غالباً وہاں کے مجاور تھے لہک لہک کر اور جھوم جھوم کر انیس کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں اور لطف یہ کہ وہی پڑھنے والے اور وہی سننے والے تھے، کوئی دوسرا متنفس وہاں موجود نہ تھا۔

فاروقی صاحب کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ مجلس عام طور پر اس لئے برپا کی جاتی تھی کہ امام حسینؑ کی دردناک شہادت کا بیان کیا جائے (ص ۹)۔ مجلس کا منشاء صرف یہی نہیں ہوتا تھا بلکہ امام حسینؑ اور اُن کے اعزہ و رفقا اہلبیت کے کردار کی مصوری[2] بھی ہوتی تھی، اُن کے فضائل و مکارم اخلاق بھی بیان کئے جاتے تھے اور خاتمہ کسی دردناک واقعہ پر ہوتا تھا جس کا مُبکی ہونا قدرتاً لازم تھا۔ مرثیہ خوانی کا مقصد میر انیس نے ایک بیت میں نظم کر دیا ہے:-

دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو تعریف بھی ہو
دہد بہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو

طریقے مختلف سہی لیکن واقعات کربلا سُنکر یا پڑھکر مغموم ہونے میں شیعہ سُنی کی تخصیص نہیں، حُبِّ اہلبیت رسول کو اپنا فرض تسلیم کرنے میں دونوں فرقے متفق ہیں۔ امام حسینؑ حضرت رسولؐ کے نواسے تھے اور ایسے نواسے جن کے متعلق حضرت شاہ معین الدین اجمیری فرماتے ہیں:-

شاہست حسین بادشاہست حسین — دین ست حسین، دیں پناہست حسین
سرداد و نداد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہست حسین

تمام دنیائے اسلام بلا تفریق ملت اس شہیدِ اعظم کا احترام کرتی اور اُس کی یاد کو ہر سال تازہ کرتی ہے، شیعہ مجلس عزا

---

[1] میرے محترم دوست سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے تصدیق کردی کہ دراصل ایسا ہوتا تھا۔ (اثر)

[2] کردار نگاری (Characterisation) نام ہے کسی مخصوص فرد کے محاسن و معائب دونوں کے تجزیہ کا اور یہیں سے مدح نگاری و کردار نگاری دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہو جاتی ہیں اور اسی لحاظ سے فاروقی صاحب نے مرثیہ میں کردار نگاری سے انکار کیا ہے کیونکہ مراثی میں کرداروں کی مدح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ خود انیس نے بھی اپنے آپ کو ہر جگہ مداح ظاہر کیا ہے۔ باسول نے جانسن کی بیاگرفی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں جانسن کی مدح کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کی کردار نگاری کرنا چاہتا ہوں، یعنی اس میں جو کمزوریاں ہیں وہ بھی ظاہر کروں گا۔ (نیاز)

منعقد کرکے، اہلِ سنت والجماعت شہادت نامہ پڑھ کر یا مجلس وعظ منعقد کرکے۔ میں نے اپنے کانوں سے شاہ محمد سلیمان پھلواروی کو دورانِ وعظ میں ذکرِ شہادت کرتے اور یہ شعر بار بار پڑھتے سنا ہے:۔

بے حُبِّ اہلبیت تو جنّت حرام ہے زاہد تری نماز کو میرا سلام ہے

مولوی ہادی علی خاں فرنگی محلی مرحوم واقعاتِ شہادت اس موثر و دلکش پیرایہ میں بیان کرتے تھے کہ ہاید و شاید۔ شیعہ ایسی محافل میں بکثرت شریک ہوتے اور اُن کے بیان کو سن کر عش عش کرتے تھے۔ حسینؑ کا غم منانے میں شیعہ اور سنی متحد ہیں، البتہ اظہارِ غم کا طریقہ مختلف ہے۔ شیعہ آہ و بکا و فریاد و ماتم کرتے ہیں۔ اہلِ سنت بلند آواز سے نہیں روتے اور نالہ و شیون سے باز رہتے ہیں مگر بشرے سے حزن و ملال کا اظہار ہوتا ہے اور آنکھوں سے اشک جاری رہتے ہیں۔ جب ہر مسلمان پر بلا کسی استثناء کے حبِ اہلبیت فرض ہے تو یہ ایک عجیب مطالبہ ہوگا کہ جس سے محبت ہے اُس کے مصائب کا حال سنکر یا پڑھکر ہمارا دل نہ دکھے اور آنکھیں نہ ڈبڈبائیں۔ خود شیعوں میں بھی ہے کہ اگر بے اختیار رونا نہ آئے تو رونے والوں کی صورت ہی بنالو۔ یہاں پہونچکر سنّی، شیعہ ایک ہوجاتے ہیں۔ رونے یا غمگین ہونے کا بنیادی اُصول یہ ہے جس کو توڑ مروڑ کر فاروقی صاحب نے کیا سے کیا بنا دیا!

بعد ازاں پھر وہی اتہام الفاظ بدل کر دُہرایا گیا ہے کہ مرثیہ کی اپیل صرف ایک فرقہ[1] کے جذبات سے ہے لہٰذا اس کا میدان بلحاظ بیان و فلسفہ محدود ہوگیا۔ (ص ۹)

خدا معلوم فاروقی صاحب کا مطلب بیان و فلسفہ سے کیا ہے لیکن مرثیہ کی ادبی وقعت اور دائرۂ اثر کا شیعیت سے وسیع تر ہونا تو اسی سے واضح ہے کہ مولانا شبلی مرحوم، مولوی عبدالحی مرحوم صاحب تذکرۂ گلِ رعنا، مولانا عبدالسلام ندوی اور نہ معلوم کتنے حضرات جو عقاید کے لحاظ سے اہلِ سنت والجماعت ہیں نیز ہندو ادیب مراثیِ انیس کی مدح میں رطب اللسان ہیں اور یہ امر مسلمات میں داخل ہوگیا ہے کہ انیس اور دبیر کے مرثیوں نے زبان اُردو کو اُس بلندی پر پہونچا دیا کہ اب دنیا کی کسی زبان کے مقابلہ میں بھی پیش کی جا سکتی ہے[2]۔

(باقی) مرزا جعفر علی خاں اثر

---

[1] اس سے غالباً اثر صاحب کو بھی انکار نہ ہوگا کہ جس حد تک مذہبی جذبات و تاثرات کا تعلق ہے، مرثیہ صرف شیعہ جماعت کی چیز ہے اور اگر دوسرے مذاہب کے اکابر نے اس کو سراہا ہے تو اس کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ اس کی لسانی خوبیوں سے ہے۔ (نیاز)

[2] اس کا اعتراف فاروقی صاحب کو بھی ہے۔ (نیاز)

معلوماتِ عامہ

قیامت کیونکر آئے گی

قیامت کے معنے یہ نہیں کہ ساری کائنات دفعتاً ختم ہو جائے، بلکہ وہ انفرادی طور پر ہر ہر کرہ کے لئے علیحدہ ہوگی اور مختلف زمانہ میں ہوگی۔ یعنی فرض کیجئے اگر کرۂ مریخ میں کل قیامت آتی ہے تو اس کے معنے یہ نہیں کہ دوسرے کروں میں بھی اسی کے ساتھ آئے یا اسی طرح آئے۔ چنانچہ ہمارے کرۂ قمر میں عرصہ ہوا قیامت آچکی ہے اور وہ آبادی سے بالکل محروم ہوگیا ہے، لیکن ہمارا کرۂ زمین اب تک محفوظ ہے۔ اس وقت ہمیں اپنے کرۂ زمین ہی کے متعلق دیکھنا ہے کہ اس میں قیامت آنے کا کب تک امکان ہے اور اس کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔

نیویارک (امریکہ) میں ایک خاص ادارہ ہے جہاں سیاروں کی حرکت و گردش کو ان کے نمونے بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ حال ہی میں وہاں بڑے بڑے ماہرین فلکیات جمع ہوئے اور انھوں نے دکھایا کہ کرۂ زمین کی تباہی کی پانچ صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ کرۂ آفتاب پھٹ جائے اور اس کی گرمی سے کرۂ زمین کا پانی اس قدر کھولنے لگے کہ یہاں کے تمام جاندار فنا ہو جائیں، دوسرے یہ کہ کوئی دُم دار سیارہ اس سے بہت قریب ہو کر گزرے اور اس کا پانی کھولنے لگے، تیسرے یہ کہ زمین میں دفعتاً اتنی سردی پیدا ہو جائے کہ لوگ ٹھٹھر کر مر جائیں، چوتھے یہ کہ چاند زمین سے قریب تر آجائے اور یہاں کے سمندروں میں اتنی طغیانی آئے کہ لوگ ہلاک ہو جائیں اور پانچویں یہ کہ فضا کا کوئی کرہ دوران گردش میں زمین سے ٹکرا جائے اور اسے پاش پاش کر دے۔

ان ماہرین فن کا یہ محض زبانی لکچر نہیں تھا بلکہ انھوں نے مصنوعی کرۂ زمین بنا کر اس پر یہ تمام آفتیں دکھا بھی دیں۔ قیامت کی پیش گوئی نئی چیز نہیں ہے، اور ہر زمانہ میں ایسی پیش گوئیاں کرنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ پانچ ہزار سال ہوئے قدیم اہلِ مصر ایک مخصوص تاریخ میں وقوعِ قیامت کی پیش گوئی کے سلسلہ میں مخصوص مراسم ادا کیا کرتے تھے۔

ممکن ہے۔ اس وقت سائنس کے دور میں اس قسم کی پیش گوئیاں اتنی زیادہ اہم نہ سمجھی جاتی ہوں، جتنی زمانۂ قدیم میں لیکن اب بھی مشکل ہی سے کوئی ایسا سال گزرتا ہوگا جب کوئی نہ کوئی پیغمبر قربِ قیامت کا اعلان کرنے کے لئے نمودار نہ ہوتا ہو اور اس کو کچھ معتقدین نہ مل جاتے ہوں۔

اس قسم کا ایک پیغمبر بہت قریب زمانۂ ماضی میں ڈنمارک کا جان مکلسن تھا۔ ۱۹۴۳ء میں یہ کوپن ہیگن کی گلیوں میں نمودار ہوا، اس حال میں کہ ایک بڑی داڑھی اس کے سینہ پر چھائی ہوئی تھی اور ایک بہت ڈھیلا ڈھالا جبہ اس کے جسم پر تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانیال نبی کا متبنیٰ کہتا تھا۔ اس نے پیشین گوئی کی کہ طوفان نوح سے زیادہ زبردست طوفان آنے والا ہے جس سے صرف وہ اور اس کے مقلدین ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس نے اس طوفان سے بچنے کے لئے کشتیاں بھی بنانا شروع کر دیں۔ اسٹاک ہوم کے ایک اخبار نے اعلان کیا کہ یہ شخص اتحادیوں کا جاسوس ہے اور سارے ڈنمارک میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ مکلسن جرمن افسروں کے پاس پہونچا اور کہا کہ مجھے اجازت دیجائے کہ میں ساحل ڈنمارک سے دور ایک کشتی میں طوفان کا انتظار کروں۔ جرمن افسروں نے یہ سمجھ کر کہ اس کا دماغ خراب ہے اسے اجازت دیدی اور یہ ایک کشتی میں بیٹھکر چلدیا۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ دانیال کا متبنیٰ طوفان کا انتظار کرنے کے بجائے ایک برطانوی آبدوز کشتی تک پہونچ گیا اور اس طرح بہت سے اہم کاغذات برطانیہ تک پہونچ گئے۔

خیر، یہ تو جاسوس تھا اور اس نے قصداً یہ سوانگ رچایا تھا، لیکن اور متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ واقعی بعض نے بہت سنجیدگی سے قرب قیامت کا اعلان کیا اور لوگوں نے اس کو صحیح باور کیا۔ صرف چار سال پہلے کی بات ہے کہ کلیفورنیا کے ایک قصبہ پساڈینا میں ایک پادری چارلاگ نے اعلان کیا کہ کرۂ زمین عنقریب پھٹنے والا ہے اور اسکے تمام باشندے ہلاک ہو جائیں گے۔ پیشین گوئی کو سنکر بہت سے لوگوں نے توبہ استغفار شروع کر دیا، جایدادیں بیچ بیچ کر قرض ادا کرنے لگے، جن جن لوگوں سے تعلقات کشیدہ تھے اُن سے خطائیں معاف کرانے لگے اور مقررہ دن جب زیادہ قریب آگیا تو سارے امریکہ میں ہلچل مچ گئی اور لوگ رصد گاہوں میں جا جاکر ماہرین فلکیات سے پوچھنے لگے کہ اب قیامت آنے میں کتنی دیر ہے۔

چند سال قبل یہی صورت جرمنی کے ایک قصبہ میں پیدا ہوگئی۔ دفعتاً وہاں خبر اُڑی کہ سیارۂ زحل اپنے محور سے ہٹ کر نہایت تیزی سے زمین کی طرف چلا آرہا ہے اور لوگوں میں سخت بے چینی پیدا ہوگئی اور بڑی مشکل سے حکومت لوگوں کے اضطراب کو دور کر سکی۔

یوروپ میں اس قسم کی پیشین گوئیاں بارہا سننے میں آئی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں اسپین کے ایک پادری نے پیشین گوئی کی کہ ۲۵ ستمبر کو دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اس خبر نے تمام یوروپ میں بے چینی کی لہر دوڑا دی اور نوبت یہانتک پہونچی کہ اخباروں نے لوگوں سے اپیل کی کہ اس خبر پر اعتبار نہ کریں اور مطلق پریشان نہ ہوں، لیکن لوگوں کو اسوقت تک یقین نہ آیا جب تک ۲۵ ستمبر کی رات گزر کر صبح کو آفتاب نہیں نکل آیا اور انھوں نے اپنے آپ کو صحیح سلامت نہیں پالیا۔

اس طرح ۱۸۹۹ء میں یہ خبر اُڑی کہ ایک دُمدار ستارہ ۱۳ نومبر کو زمین سے ٹکرائے گا اور تقریباً نصف یوروپ کی آبادی پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ لاکھوں آدمیوں نے یہ رات سربسجود عبادت میں گزاری اور جب تک صبح نہ ہوئی انھوں نے سر نہ اُٹھایا۔

اس کی توجیہ ماہرین نفسیات نے یہ کی ہے کہ انسان چونکہ غیر شعوری طور پر موت سے ڈرتا رہتا ہے اور اپنی معصیت کا احساس رکھتا ہے، اس لئے اسے قرب قیامت کی پیشین گوئی کا فوراً یقین ہو جاتا ہے۔

یہ تو خیر، مذہبی یا نیم مذہبی انسانوں کی باتیں ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ کسی نہ کسی دن کرۂ زمین کو تباہ ہونا ہے جسے سائنس داں بھی مانتے ہیں اور اس کی مختلف علمی توجیہیں کرتے ہیں، چنانچہ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ لاکھوں دمدار سیارے اور گرے روزانہ ساٹھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کے قریب سے گزرتے رہتے ہیں تو تصادم کے امکان سے وہ انکار نہیں کر سکتے۔

ہر چند فضا اس قدر وسیع ہے کہ اس تصادم کا امکان کروڑ دھویں حصہ سے بھی کم ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہی کروڑ دھواں لمحہ سامنے آجائے۔ کیونکہ بعض اوقات دمدار ستارے بہت سے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ اور انھیں میں سے ایک وہ تھا جو ۱۹۴۶ء میں صرف ۱۳۱۰۰۰ میل کی دوری سے ہو کر گزر گیا۔

اکثر ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ حادثات سے قطع نظر اگر کرۂ زمین اسی طرح چلتا رہے تو سنہ ۵۰۰۰۰۰۰۰ عیسوی تک یہاں کوئی ذی حیات یہاں کی قیامت کا دیکھنے والا باقی نہ رہے گا۔ لیکن اس قیامت کی نوعیت کیا ہوگی؟ خیال ہے کہ سورج کی حرارت رفتہ رفتہ کم ہونے کی وجہ سے کرۂ زمین کسی وقت اس قدر سرد ہو جائے گا کہ یہاں کی مخلوق فنا ہو جائیگی یعنی جس طرح چاند میں قیامت آئی ہے اسی طرح ہماری زمین پر بھی آئے گی۔

اس وقت آفتاب کا درجۂ حرارت اس کے مرکزی حصہ پر ۴ کروڑ اور سطح پر ۶ ہزار ہے، کیونکہ آفتاب میں ہیڈروجن کی کثرت اس حرارت کو قایم رکھے ہوئے ہے، لیکن جب ہیڈروجن کم ہو جائے گا تو آفتاب سکڑنے لگے گا اور زمین کو گرمی نہ پہونچا سکے گا، یہاں تک کہ وہ ایک بڑا تودۂ یخ ہو جائے گی۔

پردار الفاظ

تار کے ذریعہ سے آپ دور کی خبریں حاصل کرتے ہیں۔ ٹیلی فون کے ذریعہ سے آپ ان لوگوں سے بات کر سکتے ہیں جو آپ سے بہت دور ہیں، ریڈیو کی وساطت سے دور دراز ملکوں کی آوازیں آپ خود سن سکتے ہیں، ٹیلی ویژن کی مدد سے آپ ان لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں جو آپ سے بہت دور ہیں۔ لیکن اگر آپ تار، ٹیلی فون، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سب کو کسی ایک ہی آلہ میں ملا دیں تو کیا ہو۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں لیکن یہ سنکر آپ کو شاید حیرت ہوگی کہ ایسا آلہ حال ہی ایجاد ہو گیا ہے جس کا نام الٹرافاکس Ultra-fax ہے اور اس میں یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ لاسلکی کے ذریعہ سے تصویریں منتقل کرنے میں تو پہلے ہی کامیابی ہو گئی تھی، یعنی خبروں کے ساتھ ساتھ تصویریں بھی لاسلکی کے ذریعہ سے دور دراز ممالک میں منتقل ہونے لگی ہیں گو یہ زیادہ صاف نہیں ہوتیں اسی طرح ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے آپ اپنے کمرہ میں لندن کے کھیل تماشے اس طرح دیکھ سکتے ہیں گویا وہ آپ کے سامنے

ہو رہے ہیں - لیکن الٹرافاکس جو صورت، آواز، تحریر، اور حرکات و سکنات سب کو بیک وقت آناً فاناً منتقل کر سکتا ہے، بالکل دوسری چیز ہے، چنانچہ آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ پچھلے سال انگریزی کا مشہور ناول Gone with the wind جو تقریباً ۵ لاکھ الفاظ اور ۱۰۴۷ صفحات کی کتاب ہے - اس کی پوری عبارت دو منٹ گیارہ سکنڈ میں منتقل کی گئی -

پچھلی لڑائی میں ایک سوال یہ بھی اُٹھا تھا کہ فوجیوں کے خطوط ان کے اہل و عیال اور احباب کے پاس کیونکر جلد سے جلد پہونچائے جائیں - بحری جہازوں کے ذریعہ سے بھیجنے میں بہت دیر لگتی تھی، ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے بھیجنے میں یہ دقت تھی کہ ان خطوط کا وزن بہت ہوتا تھا اور اس کے لیجانے کے لئے متعدد جہازوں کی ضرورت ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے ہوائی جہاز زیادہ نہ پھنسائے جا سکتے تھے، اس لئے ایک اور تدبیر اختیار کی گئی، وہ یہ کہ خطوں کی بہت چھوٹی چھوٹی تصویریں ایک ہی فلم پر لے لی جاتی تھیں اور یہ تصویریں اتنی چھوٹی ہوتی تھیں کہ ۱۶ ملی میٹر کی ایک ریل میں سیکڑوں خطوں کی تصویر آجاتی تھی - پھر یہ فلم ہوائی جہاز کے ذریعہ سے صدر مقام پر بھیجا جاتا تھا اور وہاں پھر ان خطوں کو بڑے کاغذ پر چھاپ کر تقسیم کیا جاتا تھا اس سے یہ فایدہ تو ہوا کہ جن خطوط کے لے جانے کے لئے پہلے ۱۰۰ جہازوں کی ضرورت ہوتی وہ صرف ایک طیارے سے پوری ہونے لگی، پھر بھی دشواریاں بہت تھیں، فلم پر تصویریں لینا ان کو مسالہ سے دھونا، فلم کو خشک کرنا اور پھر انھیں بڑا کر کے چھاپنا اور تقسیم کرنا آسان نہ تھا، اس لئے اس وقت سے ماہرین فن اس جستجو میں تھے کہ کوئی اور آسان ترکیب خطوط کے متعلق پیدا کرنا چاہئے اور اسی جستجو کا نتیجہ الٹرافاکس ہے -

فرض کیجئے کہ میدان جنگ ایک کمانڈر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا نقشہ دیکھ رہا ہے جس میں تمام صراحتیں موجود ہیں کہ دشمن کی کتنی فوج کہاں کہاں پائی جاتی ہے اور ان پر کس طرح کس طرف سے حملہ کرنا چاہئے - دفعتاً الٹرافاکس میں سرخ روشنی نمودار ہوتی ہے اور کمانڈر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے - اس کے چند سکنڈ کے بعد ہی الٹرافاکس کے ذریعہ سے اسے دوسرا نقشہ ملتا ہے جس کو مرکزی کمانڈر نے بھیجا ہے اور اس میں کچھ اور ہدایات درج ہیں - اگر یہی خبر ٹیلی فون یا تار کے ذریعہ سے دیجاتی تو اول تو بہت دیر لگتی، دوسرے یہ خطرہ بھی تھا کہ دشمن اس گفتگو یا خبر کو اُڑا لے گا، لیکن الٹرافاکس کے ذریعہ سے آناً فاناً اطلاع ہو گئی اور یہ اندیشہ بھی نہ رہا کہ دشمن کو اس کا علم ہو جائے گا -

فرض کیجئے کسی مکان میں قتل ہوتا ہے، اور پولیس کو دوران تفتیش میں کچھ نشانات انگلیوں کے ملتے ہیں، لیکن وہ ان نشانات سے مجرم کا پتہ نہیں چلا سکتی جب تک وہ انھیں صدر مقام نہ بھیجے اور اس کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے لیکن الٹرافاکس کے ذریعہ سے ان نشانات کو فوراً صدر دفتر تک پہونچایا جا سکتا ہے اور وہاں سے اسی وقت اطلاع آسکتی ہے کہ یہ نشانات فلاں شخص کے ہیں اور اس طرح قاتل فوراً گرفتار ہو سکتا ہے -

الغرض یہ اور اسی قسم کے بہت سے کام ہیں جو اس آلہ سے لئے جاتے ہیں -

اقتباسات

آزاد جمہوریۂ ہند کی نئی زبان

آزاد ہندوستان کے دستور یا ودھان کا ہندی ترجمہ شایع ہوگیا۔ چونکہ ہندی سرکاری زبان ہے، اس لئے نام کا ہندی ترجمہ ملک کی ہر زبان میں استعمال ہونا چاہئے۔ اور وہ یہ ہے:۔

"سمپورن پربھی بہتوا سمپنا لوک منترک ماکا گونا راجیہ"

اس ترجمہ میں بڑی خوبی یہ ہے کہ یہی نام اگر دوسری زبانوں میں لکھا جائے تو ایک انچ لمبائی میں لکھا جاسکتا ہے لیکن سرکاری زبان میں اُس کے لئے کم از کم تین انچ کی ضرورت ہے!

نئی اصطلاحوں کا جو سانچہ طیار ہوا ہے اس کی رو سے کس کو کیا کہیں گے ملاحظہ ہو:۔

پردیسی (انیا دیسیا) — سند (پرامناپترا) — سکھ (تمکنا) — ڈنڈ اور ہرجانہ (پرتیکرا) رواج اور ریت (ابھی سمایا) — عدالت (نیایالیا) — بھید بھاؤ (وبھیدا) — چناؤ (نروا کانا) — بالک، بچہ (سیو) — قانون (ودھی) — شانتی (پرا شنستی)۔ اسی طرح عام ہندوستانی لفظوں کا یہ قتل عام سیکڑوں میں شمار کیجئے!

ایسے سیکڑوں لفظوں کو جو ہر صوبہ میں عام طور پر سمجھے اور بولے جاتے ہیں بارہ پتھر باہر کر دیا گیا ہے۔ مثلاً حساب، پردیسی، ضمانت، سند، سکھ، ڈنڈ، ہرجانہ، مزدوری، چناؤ، رواج، ریت، ٹھیکہ، عدالت، حوالات، حراست، بھید بھاؤ، اجرت، سرحد، قانون، بالک، بچہ، حلم، آگیا، معافی، استعفے وغیرہ وغیرہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہندی اور ہندوستانی کی ساری جڑیں اُکھڑ گئیں اور ہمیں یقین ہے کہ بہت عرصہ تک ہندی جاننے والے بھی، لاکھوں نہیں کروروں اس "شبد سدھار" کے اُلجھنوں میں اُلجھ کر دیوانے ہو جائیں گے اور جس طرح آج ہم اور خاص کر وہ لوگ جو زبان کے معاملہ میں گاندھی جی کے عقیدہ کا دامن پکڑے ہوئے ہیں، اُردو اور "ہندوستانی" کی حفاظت کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اسی طرح خود ہندی والوں کے سامنے بھی ہندی کی حفاظت کا سوال پیدا ہو جائے گا ورنہ ہندی کا صرف نام ہی نام رہ جائے گا اور ہندی زبان ختم ہو جائے گی۔ سرکاری زبان بن جانے کا

یہ نتیجہ اُس کے لئے اس قدر خطرناک ثابت نہ ہوتا تو حد درجہ تمسخر انگیز ہوتا! "سرکاری" بن جانے کے اعزاز کی کتنی بڑی قیمت بیچاری ہندی کو ادا کرنی پڑی ہے!

(ہماری زبان)

احمق پھپھوندوی کا ایک خط

"میرے ایک دو ان دوست ہیں جو گاندھی جی کے بڑے بھگت ہیں، لیکن انھیں گاندھی جی کی 'ہندستانی' والی بات پسند نہیں ہے۔ وہ شدھ ہندی کے زبردست حامی ہیں۔ اور چونکہ میں بھی ہندی ساہتیہ کا پریمی ہوں اس لئے مجھ پر بڑی عنایت کرتے ہیں۔ اکثر اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو رہتی ہے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ کوئی بدیشی شبد ان کی زبان پر نہ آنے پائے۔ اور اسی لئے وہ بہت سوچ سوچ کر گفتگو کرنے کے عادی سے ہو چکے ہیں۔ ایک دن ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔

ایک روز وہ کچھ گھبرائے ہوئے سے میرے پاس آئے، کہنے لگے آج میں بڑی کشٹ میں پڑ گیا ہوں 'بیعنامہ' کی شدھ ہندی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے کہا 'بیچی نامہ' لکھ دیجئے۔ کہنے لگے 'نامہ' تو پھر بھی رہا۔ میں نے کہا وکرنٹر پتر کیسا رہیگا۔ اچھل پڑے، بولے دھیہ ہے، کیسا شبد بتایا۔ میں نے پوچھا آخر اس لفظ کی ضرورت کیوں پڑی۔ کہنے لگے ایک دوکان مول لی ہے، کل اس کی رجسٹری ہوگی، مسودہ لکھا رہا ہوں اسکے لئے اس شبد کی آوشکتا (ضرورت) ہوئی۔ میں نے کہا پنڈت جی کیا آج اپنا 'پرنٹر' (عہد) توڑ دیا، یہ دوکان اور مسودے کے بدیشی شبد آپ کیسے بول رہے ہیں، چوکنا ہو کر بولے کیا دوکان بدیشی شبد ہے، میں نے کہاں ہاں فارسی اور عربی ہے۔ کہنے لگے پھر تو یہ رجسٹری ہو چکی۔ میں نے عرض کیا، کیا مسودہ آپ مجھے سنا سکتے ہیں، بولے کیوں نہیں اور انھوں نے پڑھنا شروع کیا "میں کہ سوہن لال پتر گلزاری لال جات برہمن رہنے والا قصبہ پھپھوند پرگنہ اور یا ضلع اٹاوہ کا ہوں"۔ میں نے ٹوک کر کہا، پنڈت جی اس ایک سطر میں آپ نے گلزار۔ ذات۔ قصبہ۔ پرگنہ۔ ضلع۔ اتنے شبد بدیسی استعمال کئے ہیں، یہ بات آپ کے دھیہ (مقصد) کے خلاف ہے مہربانی کر کے انھیں شدھ کر لیجئے۔

بولے، گلزاری تو پتا جی کا نام ہے وہ کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ رہا جات تو وہ ہندی ہے، میں نے کہا، ہندی نہیں ہے، بلکہ ہندی میں اس کثرت سے استعمال ہوتا ہے کہ ہندی بن گیا ہے ورنہ عربی ہے۔ 'بذات' اور 'ذات وصفات'، فارسی، عربی ترکیبیں ہیں۔ بولے پھر آپ ہی کچھ بتائیے، میں نے کہا خیر آگے چلئے، کہنے لگے، قصبہ، کی جگہ گرام (گاؤں) کئے دیتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کے خیال میں گرام اور قصبہ کے لئے کوئی شبد نہیں ملتا۔ میں نے کہا کوئی ہرج نہیں پرگنہ دیکھئے، کہنے لگے، اس کی جگہ بھی کوئی شبد نہیں مل رہا، تحصیل ہو سکتا تھا، مگر وہ بھی ایسا ہی ہے۔ میں نے عرض کیا، اچھا، ضلع لیجئے کہنے لگے اس کی جگہ بھی کوئی اُچت شبد نہیں ہے۔ میں نے کہا اُچت نہ سہی۔ وہ مسکرا کر چپ ہو رہے، میں نے ہنس کر کہا، آپ یہ دوکان کیوں لے رہے ہیں، جس کے کارن آپ کو اپنی پرتگیا (عہد) بھنگ (شکست) کرنی پڑ رہی ہے۔ میں تو سمجھتا

تھا کہ شاید آپ کے دماغ میں اب کوئی بدیسی شبد باقی نہیں رہا ہوگا، لیکن معلوم پڑتا ہے کہ ابھی یہ سب چور آپ کے مہمان ہیں اور جب تک آپ کی دوکان بک نہ جائے گی یہ سب آپ کا گھر نہ چھوڑیں گے۔ میری یہ بات سنکر پنڈت جی خوب ہنسے اور بولے یار سچی بات تو یہ ہے کہ بڈھا (مہاتما جی) ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میں تو مصیبت میں پڑ گیا ہوں، گھر کی عورتیں بھی مجھ پر ہنستی ہیں۔

میں نے کہا پنڈت جی معاف کرنا۔ بدیسی شبدوں سے آپ کہاں تک گھرتا (نفرت) کریں گے جب کہ آپکے (۱) بچے بدیسی ہیں۔ (۲) بچوں کی اماں (۳) ابا، بدیسی ہیں۔ آپ جس مکان میں رہتے ہیں وہ بدیسی، اس کی دیواریں، دیواروں کی قلعی، مکان کے کمرے، کمرے میں رکھی ہوئی کرسیاں، میز پر رکھا ہوا خاصدان، کمروں کا فرش، فرش پر رکھا ہوا گاؤ تکیہ، تکیہ کا غلاف، کمرے میں ایک طرف بچھا ہوا پلنگ، پلنگ پر بچھی ہوئی توشک، توشک پر لگی ہوئی چادر، پلنگ پوش، لحاف، اڈرائی، کمرے میں رکھی ہوئی الماریاں، صندوق، مکان کا زینہ، مکان کے دروازے، دروازوں کے پردے، نیچے کی دوکان، دوکان پر بیٹھنے والا درزی، درزی کی الگنی پر ٹنگے ہوئے پاجامے، قمیصیں، صدریاں، شلواریں، شیروانیاں، آپ کا باورچی خانہ، اس کی دیگچیاں، رکابیاں، پیالے، تشتریاں، کفگیر، چمچہ، آپکے منہ دھونیکا صابن، ہاتھ پونچھنے کا رومال سر پر باندھنے کا صافہ، آنکھوں میں لگانے کی عینک، پاؤں میں پہننے کے موزے، آپ کے گاؤں کا بانار، بازار میں لگے ہوئے خوانچے، خوانچوں کا مسالہ، آپ کے کھیتوں کا بمبا، کھیتوں کی آبپاشی، ربیع اور خریف کی فصلیں، فصلوں کا غلہ آپ جس کنویں کا پانی پیتے ہیں اس کا ڈول، اس کی رسی، پانی کے گھڑے، صراحی، آپکے گاؤں میں بجنے والے ڈھول، تاشے، مجیرے، نگاڑے، آپ کے گاؤں کی چوپال، اس چوپال کی بھیڑ (بمعنی مجمع) یہاں تک کہ چوپال میں دی جانے والی جھاڑو سب بدیسی ہیں۔ اس کے بعد میں نے ان کے سامنے کچھ واکیہ (جملے) رکھے جن میں عربی اور فارسی کے پرچلت (مستعمل) شبدوں کا پریوگ (استعمال) تھا۔ اور ان سے عرض کیا کہ کرپا کر کے آپ ان میں سے کسی ایک واکیہ کا ایسا انواد (ترجمہ) کر دیں جو شدھ ہندی میں ہو اور جسے عام جنتا سمجھ سکے۔ اگر آپ ایسا کر دیں گے تو میں ایک واکیہ کے لئے ایک سیر مٹھائی انعام کے طور پر آپ کی سیوا میں پیش کروں گا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہدیا کہ جلدی نہیں ہے آپ انھیں برابر دھیان میں رکھئے اور مہینہ دو مہینے میں جب آپ کسی جملے کی شدھ ہندی کر لیں تو مٹھائی لیجائیے۔ چنانچہ میں نے ان کو الفاظ نوٹ کرا دئے ہیں۔ اس درمیان میں وہ مجھے کئی بار مل چکے ہیں۔ ایک دن کہتے تھے کہ تم نے مجھے بڑی آفت میں ڈال دیا ہے۔ میں کبھی کبھی رات رات بھر جاگتا رہتا ہوں مگر ابھی تک میں ایک جملہ کی ہندی بھی نہیں بنا سکا۔ اگر کوئی بناتا بھی ہوں تو اسے خود کاٹ دیتا ہوں۔ میں اب اس نتیجہ پر پہونچ رہا ہوں کہ دیش کی بھاشا ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے اگر ٹھونس ٹھانس کر کے میں کوئی واکیہ بناتا ہوں اس میں وہ مدھرتا اور سرلتا (شیرینی اور سلاست) نہیں ہوتی جو عربی فارسی کے ان پرچلت شبدوں میں ہے۔ آخر میں انھوں نے فرمایا "میرا وشواش ہے کہ یہ بھاشا مٹنے والی نہیں ہے"۔ خدا کرے پنڈت جی کا یہ آشیرواد صحیح ثابت ہو۔ (ہماری زبان)

قبل از وقت

صبح کے سینے پہ سورج کا وہی مست اُبھار
وہی فرسودہ سا اک زاویۂ لیل و نہار

وہی ٹوٹا ہوا تارا وہی اشکِ لرزاں
وہی سہمے ہوئے ویرانے وہی اُجڑے سے باغ
وہی ٹوٹے ہوئے پیمانے وہی خشک ایاغ
خوں اُگلتے ہوئے لالے وہی سوزندہ بہار
وہی بپھری ہوئی دوزخ وہی شدت کا عذاب
وہی کافر نظریں اور وہی گمراہ ضمیر
وہی ڈوبی ہوئی نبضیں وہی کھنچتی ہوئی سانس
وہی جھلسے ہوئے ویرانے، دہکتے ہوئے شہر
ظلمتوں کا ہے وہی فرقِ مہ و مہر پہ تاج
وہی بدلے ہوئے تیمور اُسی خونخواری کے
وہی فرعون کی نخوت وہی تاروں کا دماغ
وہی بیمغز تمدن غلط اندیش اصول
وہی وحشت وہی اندازِ جنوں سامانی
پاگداز اب بھی وہی منزلیں تخریب کی ہیں
فارغِ امن نہیں طبعِ درود یرو کنشت
کوئی شعبہ نہیں اس کا ابھی شایانِ فروغ
اس کے اعصاب پہ بیٹھی ہوئی ہے برفِ جمود
سرد جذبات میں پیدا ہے خروش اور نہ خراش
اک بھٹکتا ہوا سیارہ ہے... یہ ملک ابھی،
میں یہ کہتا ہوں کہ بہتر تھا بہت بہتر تھا
ابھی گائے نہ گئے ہوتے یہ آزادی کے گیت
اس کی بنیادی حقیقت ابھی کچھ ہو ابدوست!
صبح سے پہلے وطن جاگ اُٹھا ہے شاید!

وہی شبنم وہی سُلگی سی گھٹاؤں کا دھواں
وہی بے نور سی شمعیں وہی بجھتے سے چراغ
وہی رستے ہوئے ناسور، سلگتے ہوئے داغ
وہی اُٹھتے ہوئے شعلے وہی اُگتے ہوئے خار
وہی انسانوں کے خوں کا ہمہ گیر اک سیلاب
وہی صد سالہ غلامانہ روایت کا خمیر
وہی اُترے ہوئے نشتر وہی چبھتی ہوئی پھانس
اک سمندر وہی شعلوں کا وہی خون کی نہر
ابھی برہم ہے اسی طرح عناصر کا مزاج
وہی عفریت فضاؤں میں تباہ کاری کے
وہی افلاس کا روغن وہی دولت کا چراغ
وہی ہر موڑ پہ سنگین و خطرناک سی بھول،
وہی تشکیلِ مقاصد کی زبوں سامانی
لاشیں کاندھوں پہ وطن کے ابھی تہذیب کی ہیں
ابھی خوگردۂ چنگیز ہے انساں کی سرشت
راستی اس کی فریب اسکی صداقت ہے دروغ
اس کی رگ رگ میں سرایت کئے ہے زہرِ قیود،
روح میں پہلا سا باقی نہیں وہ سوزِ تلاش
اک دہکتا ہوا انگارہ ہے... یہ ملک ابھی
اگر اس کام میں کچھ اور توقف ہوتا
اک صدی اور ابھی سوتے یہ آزادی کے گیت!
صاف محسوس یہ ہوتا ہے مجھے تو ابدوست!
وقت سے پہلے یہ آزاد ہوا ہے شاید!

ا۔ نسیم فاطمی

اُن کی سالگرہ

بھری بزم میں آئیں وہ مسکراتی
نظر میں لئے نشۂ کامرانی،
وہ چاندی سے شانوں پہ لٹ بھیگی بھیگی
خنک سی وہ راتیں سہانی سہانی
شکن در شکن سنبلِ زلفِ مشکیں
چمن در چمن عطر و عنبر فشانی
وہ زلفیں پڑی جس میں سوتی ہیں راتیں
وہ عارض کہ ہیں خلد زار جوانی
تبسم ہے لب پر کہ اک موجِ نکہت
وہ آنکھیں ہیں یا ساغرِ ارغوانی،
بھرے دوش و سینہ میں محراب کا خم
وہ چاندی سے گالوں پہ سونے کا پانی
تنفس میں شاداب پھولوں کی خوشبو،
خموشی میں اک کیفِ رنگیں بیانی،
گھٹائیں چمن پر کہ عارض پہ زلفیں،
پھواریں ہیں ٹھنڈی کہ شیریں زبانی،
حیا آنکھ میں لب پہ موجِ تبسم
شبِ ابر میں چاند کی ضوفشانی
وہ چاہیں تو ہر شب کو کر دیں کہانی
عجب کشمکش سی وہ شوق و حیا میں
ابھی دم میں پتھر، ابھی دم میں پانی
یہی ہے وہ ہنگام پندار و نصرت
ستاروں پہ ہوتی ہے جب حکمرانی
قدم کیوں نہ ہر گام پر ڈگمگائیں
یہ شاخِ کمر اور بارِ جوانی
کروں اور کیا نذر میں شمس ان کی
جوانی کا تحفہ ہے پیشِ جوانی
مری پیشکش پر اگر مسکرا دیں
بڑی مہربانی، بڑی قدردانی

پروفیسر شمس بدایونی

غزل :- شفیق صدیقی جونپوری

کیا چیز نہیں میخانے میں، پیمانہ نہیں یا جام نہیں
ہاں جب سے بہار آئی ہے مرے ساقی کی توجہ عام نہیں
کیا جانے چمن میں اب کے برس کیا موسمِ گل کا عالم ہے
سہمے ہیں نوا سنجانِ چمن صیاد کو خود آرام نہیں
کل بادِ خزاں کا شکوہ تھا پر دل میں امنگیں تھیں کیا کیا
اور آج بہار آئی ہے مگر پھولوں پہ ہنسی کا نام نہیں
جا رنج نہ دے اے بادِ سحر اے رنگِ شفق خونبار نہ کر
اب صبح ہماری صبح نہیں اب شام ہماری شام نہیں
اے صبح کے خالق راضی ہوں کترا کے چلا جائے سورج
اس گھر میں سحر بھی کیوں آئے جس گھر میں چراغِ شام نہیں
کیوں تازہ ہوا اللہ رے ہم اب سر ہیں اور انکا نقشِ قدم
اے بیخبرانِ دیر و حرم اس سجدے کی لذت عام نہیں
اے میرِ حجاز شفیق ترا تنہا ہے خود اپنی محفل میں
تیرے ہی جوانوں کو دھن ہے یا ہم نہیں یا اسلام نہیں

مطبوعات موصولہ

بوستانِ حسرت مولانا حبیب الرحمان خاں حسرت شروانی کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے جسے کانفرنس بک ڈپو علیگڈھ نے بہت اہتمام سے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

ابتدا میں سید الطاف علی بریلوی کی لکھی ہوئی تقریب ہے اور اس کے بعد جناب شروانی کا مقالہ ہے غزل فارسی پر۔ جو دونوں اپنی جگہ بہت تشنہ و نامکمل ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۲۵ سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ اس میں صفحہ ۹۰ تک جناب شروانی کی غزلیں ہیں اور اس کے بعد قطعات وغیرہ ہیں جو شادی، موت وغیرہ مختلف تقریبات کے سلسلہ میں لکھے گئے تھے۔ اس طرح اصل کتاب گویا ۵۰ صفحات کی ہے جو تقریباً ۳۵۰ اشعار پر مشتمل ہے۔

حیرت ہے کہ مولانا شروانی نے اپنی تمام عمر میں صرف اتنے ہی اشعار کہے اور اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ انھیں شایع کیا گیا، جبکہ نہ صرف کمیت بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی کوئی خصوصیت ان میں نہیں پائی جاتی۔

مولانا شروانی بڑے وسیع المطالعہ انسان ہیں اور عربی فارسی کے فضلاء میں شمار کئے جاتے ہیں، لیکن ادبی ذوق بالکل علٰحدہ چیز ہے، کلام کے بے عیب ہونے میں شک نہیں، لیکن لطف سخن سے یکسر معرا ہے۔ انھوں نے حافظ، نظیری، خسرو، اصفہانی سبھی کی غزلوں پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن وہ کوئی ایک شعر بھی اچھا نہ نکال سکے۔ ان کا ایک شعر ہے:۔

بابوئے مشک ندارد سرو کارے سرما
گیسوے یار کجا نافۂ تاتار کجاست

خواجہ عزیز الدین لکھنوی نے بوئے مشک اور گیسوئے یار کے واؤ کے اخفا پر اعتراض کیا تھا۔ شروانی صاحب نے شعر بدل کر یوں کر دیا:۔

سرِ آشفتہ ندارد سرے با مشک تتار
کاکلِ یار کجا نافۂ تاتار کجاست

خواجہ عزیز الدین کا اعتراض بوئے مشک کے اخفاء واؤ کے متعلق تو درست تھا لیکن گیسو میں واؤ کا اخفا نادرست نہیں اور اس کا علم شروانی صاحب کو ہونا چاہئے تھا۔ صائب کہتا ہے:۔

بیدِ مجنوں گیسوئے ماتم پریشاں کردہ است
تا کرا قسمت شہید رنگ طفلاں کردہ است

پہلے مصرعہ میں البتہ بوئے مشک میں واؤ کا اخفا قابل اعتراض تھا، لیکن اس عیب کو دور کرنے کے لئے جو دوسرا مصرعہ شروانی صاحب نے تلاش کیا وہ بھی عیب سے خالی نہیں، کیونکہ اس میں سرے کی تے دب کر نکلتی ہے۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ کا تنار اور دوسرے کا تاتار دونوں ایک ہی چیز ہیں اور یہ تکرار عیب سے خالی نہیں۔

غزل خواہ کسی زبان کی ہو، اس پر دو حیثیتوں سے نگاہ ڈالی جاتی ہے، مضمون آفرینی (جس میں جذبات نگاری بھی شامل ہے) یا لطف زبان۔ اور شروانی صاحب کا کلام دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر نہیں۔ نہ ان کے یہاں صحیح جذبات محبت ہیں اور نہ فارسی زبان کا لطف۔

شروانی صاحب مذہبی انسان ہیں اور غالباً ایک حد تک صوفی منش بھی، لیکن جو غزلیں انھوں نے نعت و منقبت میں کہی ہیں وہ بھی بالکل بے جان ہیں اور زہد و تقشف کی خشکی کے علاوہ ان سے اور کوئی صحیح ولولۂ محبت ظاہر نہیں ہوتا۔ ہمیں افسوس ہے کہ کانفرنس بک ڈپو نے یہ کتاب شایع کرکے نہ کوئی خدمت فارسی زبان کی کی ہے اور نہ شروانی صاحب کی۔

وقایع عالم شاہی

روزنامچہ ہے فارسی زبان میں کنور پریم کشور فراقی کا جو شاہ عالم کی مہم آگرہ میں دو مہینے تک بادشاہ کے ہمرکاب رہا۔ فراقی، راجہ جگل کشور کا پوتا تھا جو مرشد آباد کا جاگیر دار تھا اور بنگال کے صوبہ دار مہابت جنگ کی طرف سے محمد شاہ کے دربار میں وکیل تھا۔

جب یہ خاندان تباہ ہوگیا اور فراقی کو معاش کی تلاش ہوئی تو یہ دلی پہونچا اور شاہِ عالم کے لشکر میں جو دہلی سے آگرہ جارہا تھا یہ بھی شریک ہوگیا اور اسی زمانہ میں اس نے اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا جو ۱۲ محرم ۱۱۹۹ھ سے ۱۵ ربیع الاول تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مرہٹہ گردی شروع ہوگئی تھی اور مہاجی سندھیا پیشوا برسرِ اقتدار تھا۔ ان دو مہینوں کے جو واقعات فراقی نے لکھے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں اور عام تاریخوں میں نہیں ملتے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں ایک میں فراقی نے احمد شاہ کے نابینا کئے جانے کے وقت سے لیکر شاہ عالم ثانی کی تخت نشینی تک کے واقعات درج کئے ہیں اور دوسرا حصہ جس میں اس نے اپنے دو مہینے کے مشاہدات قلمبند کئے ہیں۔

یہ روزنامچہ نایاب تھا اور اس کا صرف ایک نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں پایا جاتا تھا، اسی نسخہ کو مولانا امتیاز علی عرشی نے کامل تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شایع کیا ہے مولانا عرشی کو قدیم مخطوطات کی اشاعت اور ان کی چھان بین کا خاص سلیقہ حاصل ہے، اس لئے یہ کتاب صرف فراقی کا روزنامچہ نہیں ہے بلکہ اُس عہد کی بڑی اچھی تاریخ بھی ہے۔

کتاب نہایت نفیس کاغذ پر خوشنما ٹائپ سے چھاپی گئی ہے اور ناظم کتب خانہ رام پور سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

بیان اللسان

عربی اُردو ڈکشنری ہے جسے مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی نے مرتب کیا ہے۔ اس وقت تک اُردو میں جتنی کتابیں لغت کی شایع ہوئی ہیں ان میں کوئی لغت خالص عربی

زبان کا اس قدر جامع شایع نہیں ہوا جتنا یہ ہے۔

اس میں ۲۵ ہزار لغات عربی کے ہیں جو قدیم وجدید دونوں پر مشتمل ہیں اور اس التزام کے ساتھ انھیں پیش کیا گیا ہے کہ مذکر و مونث، واحد و جمع وغیرہ کی بھی صراحت کر دی گئی ہے۔ علاوہ اس کے خاص لحاظ اس بات کا رکھا گیا ہے کہ قرآن کریم کے تمام لغات و اصطلاحات اس میں آجائیں۔

اُردو میں جو معنے دئے گئے ہیں وہ بہت صاف، واضح اور آسان ہیں، اور عربی الفاظ پر اعراب دیکر ان کا صحیح تلفظ بھی بہت احتیاط سے متعین کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ لغت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُردو کا پہلا لغت ہے جس سے قدیم وجدید عربی زبان کے الفاظ کا مفہوم نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اُردو اور عربی کے طلبہ کے لئے یہ فرہنگ بہت کار آمد ثابت ہوگا۔

ضخامت ۸۶۳ صفحات۔ کتابت وطباعت بہت صاف۔ قیمت مجلد آٹھ روپیہ، غیر مجلد سات روپیہ۔

ملنے کا پتہ:- ادارۂ علمیہ، قاضی واڑہ - میرٹھ۔

جوڑ توڑ - لقراط دونوں ناول ہیں جناب شوکت تھانوی کے لکھے ہوئے، جنھیں ادارۂ فروغ اُردو لاہور نے شایع کیا ہے۔

شوکت تھانوی اُردو کے بہت مشہور مزاح نگار ہیں اور ان کی تصانیف بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ انکی مزاح نگاری کا میدان زیادہ تر گھریلو زندگی ہے اور موجودہ معاشرت ہی کے دایرہ میں رہ کر وہ سب کچھ لکھتے ہیں، اس لئے ان کی تمام تصانیف میں ایک قسم کی یکسانیت ہوتی ہے اور ان کے پڑھنے سے کچھ گھٹن سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

مزاح نگاری بڑی مفید و کار آمد چیز ہے بشرطیکہ اس میں وسعت و تنوع کے ساتھ خیالات کی گہرائی بھی ہو اور طنز و ظرافت دونوں کے صحیح محل استعمال پر نگاہ رکھی جائے۔ شوکت صاحب کے مزاح میں اگر ہمیں کوئی کمی نظر آتی ہے تو یہی کہ اس میں وسعت و تنوع کم ہے۔ ان کے طنز و ظرافت نہ واقعات و پلاٹ سے زیادہ تعلق رکھتی ہے، نہ دنیا کے گہرے مسایل سے ——— بلکہ اس کا تعلق زیادہ تر زبان اور کسی نہ کسی طرح گزر جانے والی زندگی سے ہے، جس سے ہم کو لطف تو ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن وہ کوئی دیرپا اثر اپنے بعد نہیں چھوڑ جاتی۔ ان کی مزاح نگاری ایک ایسی غزل ہے جو گا کر خوش آوازی کے ساتھ پڑھی جائے اور سامعین سے واہ واہ حاصل کر لے۔ ان کی تحریریں ہمیں ہنساتی ضرور ہیں لیکن یہ ہنسی از خود پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کی نوعیت اس ہنسی کی سی ہوتی ہے جو گدگدی سے پیدا کی جائے اور گدگدی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے۔ سب سے بڑا مزاح نگار وہ ہے، جس کی تحریر پڑھنے کے بعد ہم اصل چیز صرف خندہ و قہقہہ کو قرار نہ دیں بلکہ اُن آنسوؤں کو جو ہنستے وقت

ہماری آنکھوں میں آجاتے ہیں اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ غم و نشاط دونوں کا مآل آخر ایک ہی سا کیوں ہوتا ہے۔

شوکت صاحب کی مزاح نگاری کا میدان یہ نہیں ہے وہ نہ اپنے کو زیادہ تھکانا پسند کرتے ہیں نہ دوسروں کو، اس لئے وہ لطایف و ظرایف سے آگے نہیں بڑھتے اور اس لئے میری رائے میں انھیں بجائے مزاح نگار کے بذلہ سنج انشاپرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بات سے بات پیدا کرنا ان کی وہ خصوصیات ہیں جو اس وقت کے لکھنے والوں میں بہت کم نظر آتی ہیں اور جن کی قدر ہمیشہ کی جائے گی۔ جوڑ توڑ کی قیمت چار روپیہ ہے اور بقراط کی ڈھائی روپیہ۔

جوئے شیر مجموعہ ہے جناب انند نرائن ملا کی نظموں، رباعیوں اور غزلوں کا جو $\frac{27 \times 17}{4}$ کی تقطیع پر نہایت عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ ۲۹۲ صفحات پر مجلد شایع ہوا ہے اور پانچ روپیہ میں مکتبۂ جامعہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

جناب ملا کا شمار اس وقت صف اول کے شعراء میں ہے اور وہ نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں سنہ ۲۶ء سے لیکر اس وقت تک کی تمام غزلیں اور نظمیں سنین کی ترتیب کے لحاظ سے دی گئی ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں کیا کیا تغیر ہوتا رہا ہے۔ جناب ملا کی خصوصیات شاعری پر پروفیسر سرور نے ابتداء کتاب میں نہایت خوب گفتگو ہے۔ ملا، کشمیری خاندان کے فرد ہیں اور اس تہذیب و شایستگی کا صحیح نمونہ ہیں جو ہندو مسلم کلچر کے امتزاج سے لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھی۔ یہی نفاست و پاکیزگی ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے، وہ چکبست اسکول سے بڑی حد تک متاثر ہیں، لیکن ان کا رنگ چکبست سے جدا ہے۔ ان کے کلام میں جوش و ولولہ کے ساتھ شیرینی و حلاوت بھی پائی جاتی ہے اور طرز بیان میں وہ ہمیشہ جدید اسلوب اور نیا زاویہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو دلکشی کی جان ہے۔ ان کے کلام میں جذبات و تاثرات کی شدت کی کمی نہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ ٹھیراؤ بھی ہے جو طوفانی کنارہ پر ایک لنگر انداز کشتی میں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں سوقیت و عامیانہ پن کہیں نظر نہیں آتا اور انکے تغزل میں بھی ایک خاص وقار نظر آتا ہے۔ وہ بڑے وطن پرست انسان ہیں، لیکن ان کا نظریۂ قوم پرستی اتنا وسیع ہے کہ اگر ہم انسانیت پرستی کہیں تو غالباً غلط نہ ہوگا اور اسی جذبۂ بلند کے تحت انھوں نے اپنی ساری قومی نظمیں لکھی ہیں۔ اس مجموعہ میں لغت و محاورہ اور فن و زبان کی خامیاں بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں، لیکن بہت کم۔ امید ہے کہ دوسرے اڈیشن میں وہ خود ان کو دور کر دینگے ضرورت تھی کہ ہم ان کا کچھ کلام بھی نمونہ کے طور پر پیش کرتے لیکن ہم اس کو اشاعت آیندہ پر ملتوی رکھتے ہیں — کیونکہ "مطبوعات موصولہ" کے سلسلہ میں اس کے لئے کافی گنجایش نہیں نکل سکتی تھی۔

تحقیق نوادر مجموعہ ہے آمنہ خاتون ام۔ اے کے گیارہ مضامین کا جن میں سے اکثر شایع یا نشر ہو چکے ہیں۔ محترمہ آمنہ خاتون میسور کی رہنے والی ہیں اور وہیں مہارانی کالج میں لکچرر ہیں، اس مجموعہ کے تمام مضامین

اُردو ادب سے تعلق رکھتے ہیں اور کافی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہیں۔ ان مضامین کی فہرست یہ ہے:-
خواتین اور اُردو۔ انشا کے شورش پسند حریف۔ انشا کے مربی۔ قواعد رسم خط۔ خلاصہ تعدیۂ فعل۔ اعلانِ نون۔ دستور الفصاحت۔ حضرت کیفی اور دریائے لطافت کا ترجمہ۔ ہندوستان میں فارسی کا نشو و نما۔ اکبر الہ آبادی اور پردہ۔ اصلاح زبان اور خواتین۔ اس فہرست سے مقالات کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

قصر بلند یا مطالعۂ قرآن جناب امام اکبر آبادی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے اسلام کی پیش کی ہوئی عملی زندگی پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ کتاب گویا عقلیت پسندانہ بیان ہے تعلیمات اسلام کا اور مخالفت ہے اس ملایانہ ذہنیت کی جس نے اسلام کو مجموعۂ اوہام و خرافیات بنا دیا ہے۔

جناب امام اکبر آبادی بہت روشن خیال مسلمان ہیں اور انکا رجحان طبیعت ہمیشہ سے بہ نسبت منقولات کے معقولات کی طرف زیادہ رہا ہے۔ اسلئے اس کتاب میں بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس رجحان کے تحت لکھا ہے۔ ابتدا میں پنڈت سندر لال کا ایک خط بھی ہے جسکو گویا ایک نوع کا تبصرہ کہنا چاہیئے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- ایچ، ایچ امام اکبر آبادی۔ آبکاری روڈ آگرہ۔

غالب یہ تالیف ہے ہندی میں جناب پنڈت دیا کشن گنجور کی جو لکھنؤ کے نہایت مشہور و معزز کشمیری خاندان کے فرد ہیں۔ گنجور صاحب کو جو ہندو مسلم کلچر کے میل سے پیدا ہونے والی تہذیب و شائستگی کا بہترین نمونہ ہیں، اُردو ادب و شاعری سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے اور انھوں نے اپنی گرانقدر قومی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات کو بھی کبھی فراموش نہیں کیا۔ غالب، گنجور صاحب کا بہت محبوب شاعر ہے یہاں تک کہ جب وہ جیل گئے تو دیوان غالب بھی ان کے ساتھ تھا اور اسی ذوق کی بناء پر سب سے پہلی کتاب جو انھوں نے ہندی میں لکھی وہ غالب پر ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دیباچہ ترخطوط غالب کو سامنے رکھ کر اس کے مختصر حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور پھر اس کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔
ہندی بہت صاف و سادہ ہے اور غالباً اس ہندوستانی کا صحیح نمونہ ہے جسے مہاتما گاندھی رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس کتاب میں غالب کے جن اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ گنجور صاحب کا ذوق شعر کتنا پاکیزہ ہے اور غالب کا مطالعہ انھوں نے کیسے صحیح زاویہ اور کتنے جچے تلے انداز سے کیا ہے۔ غالب کی ایک مستند تصویر بھی شروع میں دیدی گئی ہے۔
قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- پنڈت دیا کشن گنجور۔ لال باغ۔ لکھنؤ

کشیدہ کاری رسالہ حریم لکھنؤ کا سالنامہ ہے جو اس نام سے شایع کیا گیا ہے۔ اس خیال سے کشیدہ کاری کے بہت سے نمونے چھپے ٹسایز نہیں آسکتے، اس نمبر کو بڑے سائز پر نکالا گیا ہے اور مجلد شایع کیا ہے، اس میں جتنے نمونے دیے گئے ہیں وہ خاص طور پر اسی نمبر کیلئے طیار کئے گئے ہیں اور دوسروں کی نقل نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کشیدہ کاری کی جتنی مروجہ صورتیں ہو سکتی ہیں ان سب کے لئے ایک ایک نمونہ اس میں آجائے۔ اس خاص نمبر کی قیمت تین روپیہ ہے لیکن یہ نمبر حریم کے خریداروں کو مفت دیا جاتا ہے حریم کا سالانہ چندہ ۲ روپیہ ہے۔